(دَوَاء الغفلة)

(علاجِ غفلت)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	دنیا و آخرت	۷
۲	شبہ کا جواب	۸
۳	محل شکایت	۸
۴	اشکال و جواب	۹
۵	وجہ انتخاب	۹
۶	درجات امراض	۱۰
۷	گناہ صغیرہ کبیرہ کی حقیقت	۱۱
۸	اعتقاد اور یقین کی حقیقت	۱۱
۹	علم معتبر	۱۲
۱۰	غفلت کے درجے	۱۳
۱۱	شبہ کا ازالہ	۱۴
۱۲	آیت کے مفہوم میں عموم	۱۵
۱۳	اشتراک علت کے سبب حکم میں عموم	۱۶
۱۴	بلاغت کا قاعدہ	۱۷

۱۵	سب سے بڑا مرض آخرت سے بے فکری ہے	۱۸
۱۶	عذاب قبر	۱۹
۱۷	جنت میں جانا فعل اختیاری ہے	۲۰
۱۸	دوزخ سے بچنے اور جنت میں جانے کی تدابیر	۲۱
۱۹	تقویٰ کے شعبے	۲۲
۲۰	شبہ کا جواب	۲۳
۲۱	توکل کی حقیقت	۲۴
۲۲	ترک اسباب کا جواز وعدم جواز	۲۵
۲۳	اعمال دنیویہ اور اعمال اخرویہ میں فرق	۲۶
۲۴	ثمرات ونتائج میں توکل	۲۷
۲۵	قدرت کاملہ کا اظہار	۲۸
۲۶	حدیث کی تشریح	۲۹
۲۷	بداعمالیوں کے سبب جہنم میں داخلہ	۳۰
۲۸	شبہ کا جواب	۳۱
۲۹	عمل کی اہمیت	۳۱
۳۰	غلط فہمی کا ازالہ	۳۲

۳۱	اعمال میں کوتاہی	۳۳
۳۲	آخرت کا سکہ	۳۴
۳۳	حضرات صحابہ کرامؓ پر غلبہ خوف	۳۵
۳۴	درجات خوف	۳۶
۳۵	درجات شوق	۳۶
۳۶	شوق وخوف میں درجہ مطلوب	۳۶
۳۷	وساوس اختیاری اور غیر اختیاری کا حکم	۳۷
۳۸	ہماری نماز کی مثال	۳۹
۳۹	علاج وساوس	۳۹
۴۰	موت وآخرت کی یاد کا استحضار	۴۰
۴۱	اصلاح اعمال کی صورت	۴۲
۴۲	فضولیات میں مشغولی کا انجام	۴۳
۴۳	نور قلب کا فائدہ	۴۴
۴۴	داعیہ قلبی کا فائدہ	۴۵
۴۵	فضولیات میں مشغولی کی ممانعت کی وجہ	۴۶
۴۶	مباحات میں نیت کا فائدہ	۴۶

۴۷	مراقبہ آخرت کی تدابیر	۴۷
۴۸	سفر آخرت کی تیاری واہتمام	۴۸
۴۹	دین سے غفلت	۴۹
۵۰	اعمال ظاہرہ میں اختصار	۵۰
۵۱	صوفیاء کی اصطلاحات	۵۱
۵۲	تکمیل اعمال کی ضرورت	۵۲
۵۳	اعمال پر اجر	۵۳
۵۴	اہمیت اعمال	۵۴
۵۵	غفلت کا علاج	۵۵

وعظ

(دَوَاء الغفلة)

(علاجِ غفلت)

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کو منشی محمد یوسف صاحب نے خوجہ ضلع بلند شہر میں مدعو کیا تھا وہاں قیام کے دوران چوپال حکمت اللہ خان صاحب میں شب پنج شنبہ (جمعرات) ۱۸/ رجب ۱۳۴۱ھ کو تخت پر کھڑے ہو کر تین گھنٹے تک وعظ دواء الغفلۃ بیان فرمایا۔ تقریباً چار ہزار کا مجمع تھا پردہ میں خواتین اس کے علاوہ تھیں۔ محدث کبیر علامہ ظفر احمد تھانوی نے قلم بند فرمایا۔

موضوع یہ تھا کہ ہم لوگ عبادات کو غفلت سے ادا کرتے ہیں حالانکہ یہ سمجھ کر ادا کرنی چاہیئے کہ حق تعالیٰ کی جناب میں ایک قیمتی سودے کی قیمت پیش کر رہے ہیں ایسا نہ ہو کہ کھوٹی نکل آئے۔

انتہائی مفید مضامین بیان کئے گئے ہیں عام طور پر سب مسلمانوں کے لئے انتہائی مفید ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطاء فرمائیں۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

۱۷ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ و بارك وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿ یَعۡلَمُوۡنَ ظَاهِرًا مِّنَ الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا ۚ وَهُمۡ عَنِ الۡاٰخِرَةِ هُمۡ غٰفِلُوۡنَ ﴾(۱)

دنیا وآخرت

یہ ایک آیت ہے سورۂ روم کی جس میں حق تعالیٰ نے ایک جماعت کی شکایت مذمت کے ساتھ فرمائی ہے(۲) ترجمہ اس کا یہ ہے کہ جانتے ہیں وہ لوگ جن کے حق میں یہ آیت ہے ظاہر حیوۃ دنیا کو یہ ترجمہ میں نے اس لئے کیا کہ یہاں من بیانیہ ہے جو ظاہر کا بیان ہے کہ وہ لوگ محض ظاہر کو جانتے ہیں اور وہ ظاہر کیا ہے؟ حیوۃ دنیا (۳) اور وہ لوگ آخرت سے غافل ہیں جو کہ ظاہر کے مقابلہ میں آنے کی وجہ سے باطن سے موصوف ہونے کے قابل ہے(۴) اور حقیقت میں وہ باطن ہی ہے کیونکہ بطون کے معنی خفاء ہیں (۵) اور آخرت اس وقت مخفی اور مغیب ہے (۶) کیونکہ آنکھوں سے نظر نہیں آتی۔

(۱) سورۂ الروم: ۳۰/ ۷ (۲) برائی کے ساتھ (۳) دنیاوی زندگی (۴) جس کو ظاہر کے مدمقابل ہونے کی وجہ سے باطن سے تعبیر کرسکتے ہیں (۵) پوشیدہ (۶) پوشیدہ اور نظروں سے غائب۔

شبہ کا جواب

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ آخرت تو ابھی آئی ہی نہیں وہ تو دنیا کے بعد آئے گی تو اس وقت تو وہ وصف معدوم کی مستحق ہے (۱) نہ کہ مخفی اور مغیب سے موصوف ہونے کی۔ کیونکہ آخرت کے دو جزو ہیں ایک زمان آخرت، ایک مکان آخرت، تو اس وقت معدوم زمان آخرت ہے مکان آخرت معدوم نہیں (۲) کیونکہ اہلِ سنت کا عقیدہ ہے کہ جنت و نار مخلوق ہو چکی ہیں (۳) اور وہ اس وقت موجود ہیں اور جنت و نار ہی وہ مکان آخرت ہے جس سے غفلت کی یہاں شکایت ہے پس آخرت مکاناً معدوم نہیں بلکہ مخفی و مغیب ہے (۴) گو زماناً معدوم ہے مگر چونکہ اس زمانہ کا آنا دلائل شرعیہ سے متیقن و متحقق ہے اس لئے وہ بھی حکماً موجود ہے اور مغیب و مخفی ہی سے موصوف کئے جانے کا مستحق ہے نہ کہ معدوم کہلائے جانے کا۔

محل شکایت

ترجمۂ آیت سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہاں کس جماعت کی شکایت ہے؟ یہاں ایسی جماعت کی شکایت ہے جو دنیا ہی میں منہمک ہے ان کا ادراک دنیا ہی کی باتوں میں منحصر ہے اس سے آگے اُن کی نظر بڑھتی ہی نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس امر کی شکایت ہے کہ دنیا کی طرف ایسی توجہ ہو کہ آخرت سے غفلت ہو جائے'' یہ ہی محل شکایت اور یہ ہے حاصل آیت۔

(۱) آخرت تو چونکہ دنیا کے بعد آئے گی اس لئے اس کو پوشیدہ اور نظروں سے غائب ہونے سے تعبیر کرنے کے بجائے معدوم سے تعبیر کرنا چاہئے (۲) آخرت کا زمانہ معدوم ہے مکان یعنی جنت و دوزخ موجود ہے۔ (۳) جنت اور دوزخ کی آگ پیدا ہو چکی ہے (۴) مکان آخرت یعنی جنت دوزخ معدوم نہیں بلکہ پوشیدہ ہیں۔

اشکال وجواب

اور میرے اس خلاصہ پر یہ اشکال نہ کیا جائے کہ آیت کے عنوان سے تو غافلین کی شکایت معلوم ہوتی ہے نہ کہ غفلت کی، اور دنیا میں منہمک ہونے والوں(۱) کی مذمت ہے نہ انہماک فی الدنیا کی، تم نے غفلت عن الآخرت وانہماک فی الدنیا کو محل شکایت کیونکر قرار دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو کسی جماعت کی ذات سے عداوت و شکایت نہیں ہوا کرتی بلکہ وہ جس کی بھی شکایت و مذمت فرماتے ہیں ان کے افعال کی وجہ سے فرماتے ہیں، پس محل شکایت غافلین و منہمکین کی ذات نہیں ہوسکتی بلکہ ان کے افعال ہی محل شکایت ہیں یعنی غفلت و انہماک۔(۲) دوسرے بلاغت کا بھی تو قاعدہ ہے کہ جب کسی وصف کے ساتھ محکوم علیہ کو موصوف کرکے حکم بیان کیا جائے تو حکم کا ترتب وصف پر ہوتا ہے اور اس وصف کو حکم میں دخل ہوتا ہے جیسے اکرم زیدالعالم میں وصفِ علم پر امرِ اکرام کو مرتب کیا گیا ہے اس قاعدہ کے موافق بھی یہاں بالذات فعل ہی کی شکایت ہونا چاہئے نہ کہ فاعل کی، اس تقریر کو یاد رکھئے آئندہ کام دے گی۔

وجہ انتخاب

اس مضمون کے اختیار کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے کو بھی اس شکایت سے خالی نہیں پاتے بلکہ ایک درجہ میں یہ مرض ہمارے اندر بھی موجود ہے اور یہ مرض ہلکا نہیں ہے بلکہ ام الامراض ہے تمام گناہوں کی جڑ یہی ہے اس لئے بیان کے لئے اس کو ترجیح دی گئی۔

---

(۱) کھپنے والے (۲) آخرت سے غافل ہونا اور دنیا میں کھپنا۔

درجات امراض

اور میں نے یہ جو قید لگائی کہ ایک درجہ میں ہم میں بھی یہ مرض ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ امراض کے درجات ہیں امراض جسمانی میں بھی، جیسے بخار ایک مرض ہے اس کے درجات مختلف ہیں کوئی شدید ہے کوئی اشد ہے (۱) جیسے دق کا بخار اور کوئی معمولی ہے اسی طرح امراض نفسانی میں بھی درجات ہوتے ہیں غفلت کے بھی مختلف درجات ہیں ایک غفلت شدید اور قوی ہے اور ایک اشد واقوی ہے (۲)۔ جو درجہ شدید وقوی ہے وہ اقویٰ واشد کے مقابلہ میں تو گو ضعیف ہے مگر فی نفسہ ضعیف نہیں (۳) اس کی ایسی مثال ہے جیسے گرم پانی دو طرح کا ہو ایک تو وہ جو بدن پر ڈالنے کے قابل نہیں بہت تیز ہے مگر آبلہ بھی (۴) نہیں ڈالتا اور دوسرا وہ ہے جو پڑتے ہی بدن پر آبلہ ڈال دیتا ہے تو جو تیز پانی بدن پر آبلہ نہ ڈالے وہ آبلہ ڈالنے والے کے مقابلہ میں گو ضعیف ہے مگر اس معنی کر ہلکا بھی نہیں کہ بے تکلف منہ پر ڈال لیا جائے (۵) اب اگر کوئی اس کو دوسرے درجہ کے مقابلہ میں ہلکا سمجھ کر کسی کے ہاتھ منہ پر ڈال دے تو وہ دوسرا شخص چلائیگا اور جھلائیگا بھی کہے گا کہ تم اندھے ہو تمکو نظر نہیں آتا کہ پانی کتنا تیز ہے اس کے جواب میں اگر وہ یہ کہے کہ حضور میں تو دوسرے پانی سے ہلکا لایا تھا تو آپ کیا کہیں گے یہی کہیں گے کہ اس کے اعتبار سے یہ ہلکا سہی مگر فی نفسہ تو ہلکا نہیں بلکہ شدید اور قوی ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

آسمان نسبت بعرش آمد فرود لیک بس عالی ست پیش خاک تود

یعنی آسمان عرش ہی کے مقابلہ میں چھوٹا اور پست ہے ورنہ واقع میں زمین سے تو بہت بڑا اور بلند ہے۔

---

(۱) کوئی سخت ہے کوئی بہت سخت (۲) سخت غفلت بہت ہی زیادہ لاپرواہی (۳) اپنی ذات کے اعتبار سے کمزور نہیں (۴) چھالہ بھی نہیں پڑتا (۵) جو پانی تیز گرم ہو لیکن جسم پر چھالہ نہ ڈالے تو وہ مقابلۃ تو کم گرم ہے مگر منہ پر نہیں ڈال سکتے۔

گناہ صغیرہ وکبیرہ کی حقیقت

یہیں سے سمجھ میں آ گیا ہوگیا کہ گناہوں کی جو دو قسمیں ہیں صغیرہ وکبیرہ۔ یہ فرق اضافی ہے کہ کبیرہ کے مقابلہ میں بعض صغیرہ ہیں ورنہ حقیقت میں صغیرہ کوئی نہیں کیونکہ گناہ کی حقیقت ہے خدا کی نافرمانی، پھر یہ فعل چھوٹا اور ہلکا کیونکر ہوسکتا ہے۔ کیسا افسوس ہوتا ہے جب بعض لوگ کسی امر کی بابت استفتاء کرتے ہیں اور ان سے کہا جاتا ہے کہ یہ گناہ ہے تو اس کے بعد وہ یہ سوال کرتے ہیں کہ صغیرہ ہے یا کبیرہ ہے گویا اگر صغیرہ ہونا معلوم ہوگیا تو اُس سے نہ بچیں گے حالانکہ وہ محض کبیرہ کے مقابلہ میں صغیرہ ہے باقی قصر دین کے سوختہ کرنے کے لئے بہت کافی ہے(۱) صاحبو! اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ تیرے چھپر میں چنگاری لگ گئی ہے تو کیا وہاں بھی یہ تحقیق کی جاتی ہے کہ چھوٹی چنگاری ہے یا بڑی۔ ہرگز نہیں بلکہ فوراً پریشان ہوجاتے اور اس کے بجھانے کی فکر کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ہم لوگ گناہ کو مضر نہیں سمجھتے اور چنگاری کو مضر سمجھتے ہیں اگر ہم گناہ کو مضر سمجھتے تو اس کے ادنیٰ درجہ سے بھی نفرت کرتے اور اس کے ارتکاب سے پریشان ہوجایا کرتے کیونکہ مضر کا کوئی درجہ بھی انسان کو گوارا نہیں ہوتا مگر یہ بےفکری بتلاتی ہے کہ ہم اس کو مضر ہی نہیں سمجھتے گو اعتقاداً مضر سمجھتے ہوں مگر عملاً تو یہی حال ہے۔

اعتقاد اور یقین کی حقیقت

اور صوفیہ تو اُس اعتقاد کو جس کے مقتضا پر عمل نہ ہو یقین ہی نہیں کہتے اُن کے نزدیک اعتقاد یقینی وہی ہے جس کے موافق عمل بھی ہو اور یہ حکم محض اصطلاحی نہیں کہ صوفیہ نے دوسروں سے الگ ایک اصطلاح گھڑلی ہے بلکہ صوفیہ نے اس

(۱) دین کے قلعہ کو جلانے کے لئے صغیرہ گناہ بھی کافی ہے۔

حکم کو نصوص سے سمجھا ہے (۱) جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نجات فی الجملہ کے لئے گو اعتقاد بلا عمل بھی کافی ہو جائے (۲) مگر نجات کاملہ کے لئے کافی نہیں۔ اسی کو نصوص سے اس طرح سمجھا ہے کہ حق تعالیٰ یہود کے بارہ میں فرماتے ہیں: ﴿ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰهُ مَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ قف ط وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ط لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ ''یعنی وہ جانتے ہیں کہ جو شخص اس کو یعنی سحر کو اختیار کرے اس کے لئے آخرت میں کچھ حصہ نہیں کاش وہ جانے'' یہاں لقد علموا کے بعد جس میں اثبات علم کا ہے لو کانوا یعلمون کیسا (۳) جس میں نفی ہے علم کی؟ اس کی یہی وجہ ہے کہ ان کا عمل علم کے خلاف تھا۔ اس لئے حق تعالیٰ نے ان کے علم کو جہل شمار کیا۔ تو صوفیہ نے نصوص کو اور احکام کو دیکھ کر یہ اصطلاح مقرر کی ہے غرض یقین مطلوب اور یقین کامل بدون عمل (۴) کے حاصل نہیں ہوتا اور نہ اس کے ثمرات مطلوبہ حاصل ہو سکتے ہیں یقین و اعتقاد کا ثمرہ مطلوبہ نجات مطلقہ بدون تعذیب ہے (۳) اور یہ اعتقاد بلا عمل سے حاصل نہیں ہوتا یعنی غالب الوقوع یہی ہے کہ بدون عمل نجات کامل نہیں ہوتی (۵) گو کسی فرد میں تخلف ہو جائے۔ (۶)

علمِ معتبر

نیز محاورات بھی اسی اصطلاح کے موافق ہیں، یعنی اس اعتقاد کو جس کے موافق عمل نہ ہو اعتقاد شمار نہیں کیا جاتا۔ مثلاً ایک شخص اپنے باپ کے ساتھ گستاخی کرتا ہو تو کہتے ہیں ارے کمبخت یہ تیرا باپ ہے حالانکہ یہ علم اس کو پہلے سے حاصل

(۱) قرآن وحدیث سے (۲) مطلقاً نجات کے لئے عقیدہ کا درست ہونا بھی کافی ہے چاہے عمل کچھ نہ ہو (۳) علم کو ثابت کرنے کے بعد اس کی نفی کیوں کی وجہ یہی ہے کہ ایسا علم جس کے مطابق عمل نہ ہو جہل ہے (۴) بغیر عمل (۵) یقین و اعتقاد سے مقصود یہی ہے کہ بغیر عذاب کے نجات ہو (۴) عام قاعدہ یہی ہے کہ بغیر عمل کئے کامل نجات نہیں ہوگی (۶) اگرچہ کسی سے اس کے خلاف معاملہ ہو جائے کہ اس کی نجات صرف اعتقاد صحیح کی وجہ سے ہو جائے۔

ہے کہ یہ میرا باپ ہے مگر چونکہ اس کا عمل اس علم کے خلاف تھا اس لئے علم کو بمنزلہ عدم علم کے سمجھ کر کہا جاتا ہے یہ تیرا باپ ہے۔ نیز حدیث میں ہے من ترك الصلوٰة متعمدا فقد كفر اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ نماز کا عمداً ترک کرنا یہ بتلاتا ہے کہ اس شخص کو اس کی فرضیت کا اعتقاد نہیں یعنی کامل اعتقاد نہیں بلکہ اعتقاد میں نقص ہے(۱) اسی نقص کی وجہ سے اس پر کفر کا اطلاق کیا گیا جو مقابل ہے ایمان کا، جب ایمان اعتقاد کامل کا نام ہوگا تو اس کا ارتفاع کفر سے مسمی ہوگا(۲)۔ نیز ایک حدیث میں ہے لا يزنى الزانى حين يزنى وهو مؤمن (۳) یہ سب نصوص صوفیہ کی اصطلاح کی مؤیدات ہیں تو صوفیہ کے نزدیک تو گویا اعتقاداً بھی ہم گناہ کو مضر نہیں سمجھتے (۴) کیونکہ عمل اس کے خلاف ہے اور جس اعتقاد کے خلاف عمل ہو وہ ان کے یہاں اعتقاد ہی نہیں۔

غفلت کے درجے

البتہ فقہاء کے نزدیک یعنی ان کی اصطلاح کے موافق ہمارا ان کو مضر سمجھنا یہ اعتقاد ہے مگر عملاً وحالاً انکے نزدیک بھی مضر ہونے کا اعتقاد نہیں ہے جبھی تو صغیرہ پر جرأت ہے (۵) تو غفلت کا ایک درجہ تو یہ ہوا جس کو درجہ ضعیفہ کہا جاتا ہے مگر وہ اقوی کے مقابلہ میں ضعیف (۶) بنے ورنہ فی نفسہ یہ بھی قوی ہے۔

اور دوسرا درجہ غفلت کا کفر جحود یا عناد ہے یہ اقوی واقبح ہے (۷) ہر چند کہ اس درجہ سے بحمداللہ خدا تعالیٰ نے ہم کو محفوظ رکھا ہے مگر دوسرا درجہ معصیت کا جس

(۱) اعتقاد میں کمی ہے (۲) جب ایمان نام اعتقاد کامل کا ہے تو اس کی ضد یعنی کامل اعتقاد نہ ہونا کفر کہلائے گا (۳) زانی زناء نہیں کرتا دراں حالیکہ وہ مؤمن کامل ہو (۴) نقصان دہ (۵) اسی لئے تو گناہ صغیرہ کا ارتکاب کر لیتے ہیں (۶) غفلت کا یہ درجہ قوی کے مقابلہ میں ضعیف ہے لیکن اپنی ذات کے اعتبار سے کمزور نہیں (۷) کفر وانکار اور دشمنی یہ غفلت کا دوسرا درجہ ہے جو بڑا اور بہت برا ہے۔

میں ایسی غفلت ہو کہ مطلوب کا استحضار نہ ہو اس میں ہم بھی مبتلا ہیں، اور اس سے خالی نہیں ہیں اب جس درجہ کی غفلت ہوگی اسی درجہ کی مذمت ہوگی۔ گو درجۂ کفر کی مذمت ہم میں نہ ہو مگر مطلق مذمت وشکایت سے تو ہم بھی صاف اور بری نہیں ہیں اس لئے میں نے اپنی تقریر میں ایک درجہ کی قید لگائی تھی۔

شبہ کا ازالہ

اور یہاں سے ایک شبہ جاتا رہا وہ یہ کہ یہ آیت تو کفار کے حق میں جیسا کہ سباق وسیاق سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس سے پہلے ہی ﴿ وَعْدَاللّٰهِ ط لَايُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ﴾ فرماتے ہیں۔ کہ یہ (جو اوپر مذکور ہوا جو ایک پیشین گوئی ہے) خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے اور خدا تعالیٰ اپنی وعدہ کے خلاف نہیں کرتے اور اس کا مقتضا یہ ہے کہ اس کا کوئی انکار نہ کرتا مگر ایسے بھی بہت لوگ ہیں جو اس کا انکار کرتے ہیں چنانچہ آگے بطور استدراک فرماتے ہیں ﴿وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ یہاں پر گو لَا يَعْلَمُوْنَ کا مفعول بھی مذکور نہیں مگر مقام کا مقتضا یہ ہے کہ مفعول وہی ہو جو پہلے مذکور ہے لَا يَعْلَمُوْن۔ ان اللّٰه لا يخلف وعده اور یہ حالت کفر کی ہے اس لئے یہ آیت کفار سے مخصوص ہوئی آگے فرماتے ہیں ﴿ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ اس کا مرجع بھی وہی ہے جو پہلے لَا يَعْلَمُوْن میں مذکور ہے ورنہ اس آیت کو ماقبل سے ربط نہ ہوگا اور ضمائر میں بھی انتشار ہوگا اس کے بعد ﴿ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ﴾ فرمایا تو وہ بھی کفار ہی کے حق میں ہوگا تو اس بناء پر اس میں غفلت اعتقادی ہی مراد ہوگی نہ کہ غفلت عملی۔ اور غفلت اعتقادی یہ ہے کہ آخرت وقیامت کا انکار کیا جائے اور ظاہر ہے کہ یہ شان کفار ہی کی ہے یہ تو سباق تھا آگے فرماتے ہیں ﴿ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۭ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا

بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ 8﴾(۱) یہ سیاق ہے، تو سباق وسیاق دونوں کا مقتضا یہ ہے کہ یہ آیت کفار کے بارے میں ہو۔ پھر جب یہ کفار کے بارے میں ہے تو ہم اس سے بے فکر رہیں ہم کو اس کا مخاطب کیوں بنایا جاتا ہے۔ اور اس کی تائید عبداللہ بن عمرؓ کے قول سے ہوتی ہے کہ انہوں نے خوارج کی شکایت فرمائی کہ جو آیات کفار کے باب میں تھی انکو ان لوگوں نے مسلمانوں پر عام کردیا اس سے اور بے فکری ہوگئی یہ شبہ کی تقریر تھی۔ پس میری تقریر میں جو ایک درجہ کی قید ہے اُس سے یہ شبہ جاتا رہا یعنی غفلت کاملہ بیشک کفار کے ساتھ خاص ہے لیکن ایک درجہ کی غفلت تو مسلمانوں میں بھی ہے۔

آیت کے مفہوم میں عموم

اور اس طرح سے خود حضور ﷺ نے اور حضرات صحابہؓ وائمہ مجتہدین نے بعض آیات کو جو کفار کے بارے میں ہیں عام لیا ہے۔ چنانچہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی ﴿لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ﴾(۲) تو اس کو سنکر حضرت صدیقؓ گھبرا گئے اور حضور سے عرض کیا یارسول اللہ اگر ہر عمل پر مواخذہ ہوگا ہم تو سب ہلاک ہوجائیں گے حضور ﷺ نے فرمایا کہ چھوٹے چھوٹے گناہوں کا کفارہ تو رات دن کے مصائب بھی ہوجاتے ہیں، حالانکہ یہ آیت بظاہر عام نہیں بلکہ اہل کتاب کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ اس کے شان نزول میں اہل کتاب اور مسلمانوں کا اختلاف ہے۔ مسلمان اپنے کو جنتی کہتے تھے اور اہل کتاب اپنے کو، اس کا فیصلہ ان آیتوں میں کیا گیا ہے جن میں سے یہ

(۱) ''اور ان چیزوں کو جو اُن کے درمیان میں ہیں کسی حکمت ہی سے اور میعاد معین کے لئے پیدا کیا ہے سورۂ روم: ۸ (۲) ''نہ تمہاری اُمیدوں پر مدار ہے نہ اہل کتاب کی امیدوں پر جو کوئی بُرا کام کرے گا اُس کی سزا پاویگا''۔

آیت تو تفاسر کے باب میں ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ آگے فرماتے ہیں ﴿وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا﴾ یعنی وہ خدا کو چھوڑ کر کسی کو اپنا ولی اور مددگار نہیں پائیگا۔ یہ مسلمانوں کے باب میں نہیں ہوسکتی کیونکہ انہوں نے خدا تعالیٰ کو کہاں چھوڑا ہے اور یقیناً حق تعالیٰ مسلمانوں کے ولی و ناصر ہیں ہاں اگلی آیت مسلمانوں کے بارے میں ہے: ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ○ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ○﴾ (۱) یہ بیشک مسلمانوں کے متعلق ہے اور پہلی آیت کا مقابل ہے۔

اشتراک علت کے سبب حکم میں عموم

رہا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے قول کا جواب تو بات یہ ہے کہ خوارج نے تو مسلمانوں کو کفار میں داخل کرنے کے لئے ان آیات کو ان پر منطبق کیا تھا کیونکہ ان کے نزدیک ارتکاب کبیرہ کفر ہے عبداللہ بن عمرؓ کے قول میں اس تعمیم کی مذمت ہے اور ایک صورت تعمیم کی یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ مسلمان گو اس آیت کے مورد نہیں ہیں مگر اشترک علت کی وجہ سے کسی درجہ میں ان کو اس میں داخل کر کے خطاب کیا جاتا ہے تو صحابی کے قول میں اس کی نفی نہیں ہے بلکہ بعض صحابہؓ سے اس طرح کی تعمیم ثابت ہے چنانچہ ایک صحابی تھے یوم تبیض وجوہ و تسود وجوہ میں تسود وجوہ کو خوارج کی باب میں فرمایا حالانکہ وقت نزول آیت کی خوارج کا وجود بھی نہ تھا نیز وہ اہل قبلہ میں سے ہیں ان کو کافر نہیں کہا جاتا اور یوم تسود وجوہ کفار کے باب میں ہے مگر فی الجملہ کسی درجہ میں اشتراک علت کی وجہ سے خوارج کو بھی اس کا

(۱) ''اور جو کوئی کام کرے اچھے، مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان رکھتا ہو سو وہ لوگ داخل ہوں گے جنت میں اور ان کے حق ضائق نہ ہوگا تل بھر اور اس سے بہتر کس کا دین جس نے پیشانی رکھی اللہ کا حکم پر اور نیک کاموں میں لگا ہوا ہے اور چلا دین ابراہیم پر جو ایک طرف کا تھا اور اللہ نے بنالیا ابراہیم کو خالص دوست ۱۲۵۔

مصداق کہہ دیا گیا۔ نیز امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن سے حجت اجماع مستنبط کرنے کے لئے نہ معلوم کتنی دفعہ قرآن ختم کیا پھر یہ آیت نکالی ﴿ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ م بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ط وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴾(۱) حالانکہ یہ آیت کفار کے باب میں ہے کیونکہ من یشاقق الرسول مسلم کی شان نہیں ہوسکتی مگر امام شافعی نے اس سے حجیت اجماع کا عام حکم مستنبط کیا ہے جو اہل اسلام کو بھی عام ہے۔ غرض معلوم ہوا کہ بعض دفعہ ایک آیت کا مصداق ومسوق لہ الکلام (۲) اور کچھ ہوتا ہے اور دوسرے کو تشبیہات اس میں داخل کیا جاتا ہے یہ بندش میں نے شبہات کو دفع کرنے کے لئے کی ہے کیونکہ آجکل اردو میں کتابیں بہت ہوگئی ہیں شاید کوئی تراجم قرآن یا اردو تفاسیر میں اس آیت کو کفار کے ساتھ خاص دیکھ کر شبہ کرتا تو میں نے اس کا جواب دیدیا ہے اور اس اشکال کے جوابات کی لم میری (۳) تقریری سابق سے معلوم ہوگئی ہونگی جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ حق تعالیٰ کو کسی ذات سے نفرت وبغض نہیں بلکہ اعمال سے ہے۔

بلاغت کا قاعدہ

نیز یہ کہ بلاغت کا قاعدہ ہے کہ جب حکم کو کسی وصف پر مرتب کیا جاتا ہے تو وصف کو حکم میں دخل ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت گو کفار کے حق میں نازل ہوئی ہے مگر حکم کو مرتب کیا ہے دو باتوں پر ایک یہ کہ وہ محض دنیا ہی کو جانتے ہیں اُسی میں منہمک ہیں (۴) دوسرے یہ کہ وہ آخرت سے غافل ہیں معلوم ہوا کہ شکایت ومذمت (۵) میں ان اوصاف کو دخل ہے پھر ہر چند کہ کفار کا انہماک فی الدنیا

(۱) ''اور جو کوئی مخالفت کرے رسول کی جب کے کھل چکی اس پر سیدھی راہ اور چلے سب مسلمانوں کے رستہ کے خلاف تو ہم حوالہ کریں گے اس کو وہی طرف جو اُس نے اختیار کی اور ڈالیں گے ہم اُس کو دوزخ میں اور وہ بہت بُری جگہ پہنچا'' (۲) جس غرض کے لئے کلام لایا جاتا ہے (۳) اس اشکال کی وجہ میری سابقہ تقریر سے معلوم ہوگئی ہوگی (۴) دنیا میں کھپے ہوئے ہیں (۵) برائی میں۔

اور غفلت عن الآخرۃ درجۂ اقوی میں ہے(۱) لیکن اگر کسی مسلمان میں یہ اوصاف کسی درجہ میں ہوں تو اُسی درجہ کی موافق شکایت اس کی بھی ہوگی اور وہ بھی فی الجملہ مذمت کا مستحق ہوگا۔

سب سے بڑا مرض آخرت سے بے فکری ہے

اور ظاہر ہے کہ ہم لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں تو اس کی اصلاح کی ضرورت ہوئی مگر ہم لوگوں کو اس مرض سے بہت غفلت ہے یہاں تک کہ اس کو مرض ہی نہیں سمجھا جاتا چنانچہ بعض مصلحان قوم کی جو اپنی زعم میں مصلح قوم ہیں یہ حالت ہے کہ وہ شرابی کی شراب چھوڑاتے ہیں اور مسلمانوں کو نماز کی بھی ترغیب دیتے ہیں غیبت جھوٹ سے بھی

روکتے ہیں مگر اس ام الامراض کا جو کہ غفلت عن الآخرۃ ہے کوئی معالجہ نہیں کرتا (۲) اور نہ کوئی یہ پوچھتا ہے کہ اس کا علاج کیا ہے؟ حالانکہ حوادث کا اور خصوص موت کا کوئی ضابطہ نہیں کہ بچپن میں نہ آئے جوانی میں آئے یا جوانی میں نہ آئے بڑھاپے میں آئے۔ شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود (۳) پھر آخرت سے اتنی غفلت کس بھروسہ پر ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اپنے واسطے پہلے سے قبر کھود کر رکھنا مکروہ ہے کیونکہ کیا خبر ہماری موت کہاں آئے گی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ م بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ﴾ (۴) تو قبر کا کسی جگہ کھودنا گویا در پردہ یہ دعوی کرنا ہے کہ میری موت اسی بستی میں آئے گی اور اس میں ایک گونہ معارضہ ہے نص کا (۵) اس لئے مکروہ ہے۔

(۱) کفار کا دنیا میں کھپنا اور آخرت سے غفلت بڑے درجہ میں ہے (۲) مگر اس سب سے بڑی بیماری جو کہ غفلت ہے اس کا کوئی علاج نہیں کرتا (۳) شاید کہ یہی آخری لمحات ہوں اور اس کے بعد موت آجائے (۴) کوئی نفس نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا (۵) اس میں مخالفت ہے حکم قرآنی کی کہ قرآن میں ہے کہ انسان کو معلوم نہیں وہ کس زمین میں مرے گا۔

عذاب قبر

غرض موت کو آنے کا کسی کو علم نہیں ہوسکتا کہ کب اور کس جگہ اور کس حال میں آئے گی پھر موت کے بعد کے واقعات سرسری نہیں ہیں کیا مسلمانوں کے کانوں میں یہ بات نہیں پڑی کہ قبر میں کیا حال ہوگا کیا کسی کے پاس کوئی دستاویز ہے کہ وہ قبر میں جواب ٹھیک ہی دے گا حدیث میں ہے: (القبر روضة من رياض الجنة او حضرة من حفر النار) کہ قبر یا تو جنت کا ایک باغ ہے یا جہنم کا ایک گڑھا ہے یعنی اگر امتحان میں پاس ہوگئے تو راحت کی جگہ ہے اور فیل ہوگئے تو سخت مصیبت کا سامنا ہے ؎

فان كنت لا تدرى فتلك مصيبة　　وان كنت تدرى فالمصيبة اعظم(۱)

اگر کسی کو آخرت کا اعتقاد نہ ہوتو اس کی زیادہ شکایت نہ تھی مگر ایمان واعتقاد کے بعد اس غفلت پر حیرت ہے۔ افسوس ہماری قلوب کیسے سخت ہوگے ہیں ہر چند کہ علماء نے یہ کہا کہ قبر کے بارے میں جو نصوص وارد ہیں وہ مومن کامل اور کافر کے متعلق ہیں (۲) اور مسلم عاصی (۳) کے متعلق کوئی نص صریح نہیں کہ اُس کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا مگر پھر بھی محققین نے فیصلہ کیا ہے اور ٹھیک کیا ہے کہ اس کے ساتھ معاملہ بین بین ہوگا(۴) یہ شخص کافر کے مقابلہ میں راحت کے اندر ہوگا اور مؤمن کامل کی نسبت سے عذاب میں ہوگا جیسے جہنم کے عذاب میں بھی مسلم عاصی کے لئے یہی حکم ہے تو وہی فیصلہ یہاں ہونا چاہئے پس مسلم عاصی کو قبر میں عذاب ہوگا

(۱) اگر تم نہیں جانتے تو یہ مصیبت کا باعث ہے اور اگر جانتے ہو تو یہ بڑی مصیبت ہے (۲) راحت قبر یا عذاب قبر کے بارے میں جو صریح حکم قرآن و حدیث میں ہے وہ مؤمن کامل اور کافر کے بارے میں ہیں (۳) گناہگار مسلمان کے بارے میں کوئی واضح حکم نہیں ہے (۴) درمیانہ درجہ کا معاملہ ہوگا نہ کافر کا سا عذاب نہ مؤمن کامل کی سی راحت۔

گو کافر سے کم ہی ہو۔ پھر قبر سے نڈر کیونکر ہوگئے دنیا میں ہماری یہ حالت ہے کہ ہلکی سی گرمی کو برداشت نہیں کر سکتے تو کیا جہنم کی گرمی کو برداشت کرلوگے جو قبر میں پہنچے گی؟۔

جنت میں جانا فعل اختیاری ہے

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اچھا صاحب ہم نے مانا کہ قبر میں عذاب ہوگا تو کیا کریں قسمت میں جو ہے ہوجائیگا میں کہتا ہوں کہ یہ بات دنیا کے معاملات میں کیوں نہیں اختیار کی جاتی کہ بس ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاؤ اور دل سے کہدو کہ جو قسمت میں ہوگا ہوجائیگا آخر اس فرق کی کیا وجہ ہے کہ دنیا کی تکالیف دفع کرنے کے لئے تو تدابیر کی جاتی ہیں دھوپ سے بچنے کو چھتری لگاتے ہیں لو سے بچنے کو خس کی ٹٹیاں لگاتے ہیں اور سایہ تو ہر شخص ڈھونڈتا ہے مگر آخرت کے لئے کوئی تدبیر نہیں کی جاتی اس کے متعلق عموماً یہ اعتقاد ہوگیا ہے کہ آخرت کا معاملہ ہمارے اختیار سے بالکل باہر ہے۔ صاحبو! یہ اعتقاد بالکل غلط ہے اور صراحۃً نصوص کے خلاف ہے گو اس مخالفت نصوصاً پر جہل کی وجہ سے میں ان لوگوں پر کفر کا فتوی تو نہیں لگاتا مگر اس کو جہل شدید ضرور کہا جائیگا۔ قرآن میں نصوص بھری ہوئی ہیں جن سے نجات آخرت کا داخل اختیار ہونا صاف صاف معلوم ہوتا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾(۱) جس میں مسابقت الی الجنت کا امر ہے (۲) اگر جنت میں جانا ہمارے اختیار میں نہیں ہے تو حکم سابقوا کیوں ہے؟ معلوم ہوا کہ ہمارے اختیار میں ہے کیونکہ حق تعالیٰ اختیاری امور ہی کا مکلّف فرمایا کرتے ہیں غیر اختیاری امور کا مکلّف نہیں فرماتے نص موجود ہے لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا (۳) شاید اس

(۱) ''تم اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف دوڑو اور ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین کے برابر ہے'' سورہ الحدید:۲۱ (۲) جنت کی طرف دوڑنے کا حکم ہے (۳) اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ کا حکم نہیں دیتے۔

پر یہ شبہ ہو کہ جنت و دوزخ ہم کو نظر تو نہیں آتی جو اس میں کود کر پہنچیں یا کود کر باہر نکل جائیں یا دور بھاگ جائیں پھر اس کی طرف سبقت کس طرح کی جائے یا دوزخ سے کیونکر بچا جائے۔ تو سمجھ لیجئے کہ کسی فعل کے اختیار ہونے کے دو معنی ہیں ایک یہ وہ بلا واسطہ اختیاری ہو جیسے کھانا کھانا اختیاری ہے پانی پینا اختیاری ہے دوسرے یہ کہ بواسطہ اختیاری ہو یعنی اس کے اسباب اختیاری میں ہوں جیسا کہ خورجہ سے دہلی پہنچ جانا اور کلکتہ یا بمبئی پہنچ جانا اسی معنی کر اختیاری ہے کیونکہ یہاں سے بمبئی کود کر کون پہنچ سکتا ہے لیکن پھر بھی اس کو اختیاری کہا جاتا ہے جس کے یہی معنی ہیں کہ اس کے اسباب اختیاری ہیں یعنی مسافت قطع کرنا اور غور کر کے دیکھا جائے تو زیادہ افعال اختیاری اسی دوسری قسم کے ہیں مثلاً نکاح کر کے بچے جنوانا زراعت سے غلہ حاصل کرنا تجارت سے نفع حاصل کرنا اختیاری ہے تو کیا یہ ایسا اختیاری ہے کہ آپ بلاواسطہ جب چاہیں حاصل کرلیں ہرگز نہیں بلکہ اسی معنی کر اختیاری ہے کہ اسباب اختیار میں ہیں اسباب کو اختیار کرو امید ہے کہ مسبب حاصل ہوجائیگا پس جنت میں جانا بھی اسی معنی کر اختیاری ہے کہ اس کے اسباب آپ کی اختیار میں ہیں۔

دوزخ سے بچنے اور جنت میں جانے کی تدابیر

قرآن و حدیث کو دیکھو معلوم ہوگا کہ حق تعالیٰ نے دوزخ سے بچنے اور جنت میں جانے کے لیے اسباب و تدابیر بتلائی ہیں ان کو اختیار کرو بس خدا تعالیٰ تم کو خود جنت میں پہنچادیں گی اور دوزخ سے بچادینگے چنانچہ اسی جگہ ارشاد ہے: ﴿وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ﴾ (۱) اس سے معلوم ہوا کہ کفر موجب دخول نار ہے (۲) اور ﴿وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ

(۱) اس آگ سے بچو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے (۲) کفر دوزخ میں جانے کا سبب ہے۔

وَالْاَرْض﴾(۱) کے بعد ارشاد ہے ﴿اعدت للمتقین﴾(۲) اس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ موجب دخول جنت ہے(۳)۔

تقویٰ کے شعبے

پھر تقویٰ کی تفصیل قرآن میں جابجا مذکور ہے چنانچہ اسی جگہ ارشاد ہے: ﴿الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ط وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴾(۴) اس میں انفاق کظم وغیظ وعفو واحسان(۵) کا بیان ہے دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ج وَ اٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ لا وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ج وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ ج وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا ج وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَ حِیْنَ الْبَاْسِ ط اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ط وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾(۶) اس میں تمام ابواب تقویٰ کو اجمالاً بیان کردیا گیا ہے جس میں اول محض صورت بے معنی کو کافی سمجھنے کی ممانعت ہے (دل علیہ قولہ لیس البر ان تولوا وجوھکم الخ)(۷) جیسا کہ منافقین و یہود نے تحویل قبلہ کی گفتگو کا شغل بنالیا تھا اس کے بعد ایمان باللہ وایمان بالمعاد اور ایمان بالملائکۃ اور ایمان بکتبِ سماویہ اور ایمان بالانبیاء کا امر ہے(۸) یہ تو اعتقادیات کے متعلق ہے پھر حبّ مال کو انفاق سے زائل کرنے کا امر ہے(۹) (یا محبت الٰہیہ میں

(۱) اپنے رب کی مغفرت کی طرف بڑھو اور جنت کی طرف کہ جس کا عرض آسمان وزمین کے برابر ہے (۲) نیک لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے (۳) تقویٰ اختیار کرنا جنت میں داخلہ کا سبب ہے (۴) ''جو خرچ کیے جاتے ہیں خوشی میں اور تکلیف اور دبالیتے ہیں غصہ اور معاف کرتے ہیں لوگوں کو اور اللہ چاہتا ہے نیکی کرنے والوں کو'' سورۂ ال عمران:۱۳۴ (۵) اللہ کی راہ میں خرچ کرنا، غصہ پہنچانا معاف کرنا دوسروں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنا (۶) سورۂ بقرہ:۱۷۷ (۷) لیس البران تولوکی آیت اس پر دلیل ہے (۸) اللہ پر آخرت پر فرشتوں اور آسمانی کتابوں اور انبیاء پر ایمان لانے کا حکم ہے (۹) مال کی محبت کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم سے دور کیا۔

مال خرچ کرنے کی ترغیب ہے یہ اصلاح قلب کے متعلق ہے پھر اقامت صلوٰۃ کا امر ہے یہ طاعت بدنیہ ہے پھر ایتاء زکوٰۃ کا یہ طاعت مالیہ ہے اور اوپر جو ایتاء مال کا ذکر ہوا ہے وہ انفاق تطوع ہے[۱] جس کی حدیث ترمذی میں تصریح ہے (ان فی المال لحقا سوی الزکوٰۃ ثم تلا الآیۃ)[۲] ''اور علی حبہ اس کا قرینہ بھی ہے کیونکہ اگر اسکا مرجع مال ہے تو حبِّ مال کے ازالہ کے لئے فقط ایتاء زکوٰۃ کافی نہیں[۳] کچھ زائد انفاق کرنا چاہئیے اور اگر اللہ تعالیٰ مرجع ہیں تو حب الٰہی کا مقتضا بھی یہی ہے کہ فرض کے علاوہ کچھ مال محض محبت کی وجہ سے خرچ کیا جائے ۱۲) اس کے بعد ایفاء عہد کا امر ہے جو معاشرت کے متعلق ہے پھر صبر کا امر ہے جو سلوک کے متعلق ہے۔ غرض اس میں تمام شعب تقویٰ کو اجمالاً جمع کر دیا گیا ہے اسی لئے اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ پر اس کو ختم فرمایا ہے۔ تو اب بتلائیے کہ خدا تعالیٰ نے یہ تدابیر بتلائی ہیں یا نہیں اور یہ تدابیر اختیاری ہیں یا نہیں تو اب جنت میں جانا اختیاری ہوا یا نہیں۔

شبہ کا جواب

رہا یہ کہ تدابیر تو حق تعالیٰ نے بتلائی ہیں مگر ان پر عمل کرنا اور ان کو بجالانا تو مشیت پر موقوف ہے[۴] بدوں مشیت کے کچھ نہیں ہوسکتا۔ تو بیشک یہ ہمارا عقیدہ ہے مگر اس میں جنت و دوزخ ہی کی کیا تخصیص ہے، دنیا کے بھی سب کام مشیت ہی پر موقوف ہیں کھیتی کرنا ملازمت کرنا بھی تو مشیت پر موقوف ہے پھر ان کے لئے کیوں سعی کی جاتی ہے وہاں تو یہ کہا جاتا ہے کہ ؎

---

(۱) نفلی صدقات (۲) زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال میں غربا کا حق ہے (۳) مال کی محبت زائل کرنے کے لئے صرف زکوٰۃ دینا کافی نہیں کچھ زیادہ خرچ کرے (۴) اللہ کے چاہنے پر منحصر ہے۔

رزق ہر چند بیگمان برسد لیک شرط است جستن ازدرہا (۱)

اورمرنا بھی تو مشیت پر موقوف ہے پھر سانپ بچھو وغیرہ سے کیوں حفاظت کی جاتی ہے اس کے متعلق یوں کہتے ہیں ؎

گرچہ کس بے اجل نخواہد مرد تو مرو در دہان اژدرہا(۲)

یہ کیا کہ سارا توکل امور آخرت ہی میں صرف کیا جاتا ہے اگر بڑا توکل کا دعویٰ ہے تو پہلے دنیوی امور میں بھی تو کیا ہوتا۔

توکل کی حقیقت

میں توکل کو منع نہیں کرتا بلکہ آپ کی غلطی ظاہر کرتا ہوں کہ جس کو آپ نے توکل سمجھا ہے وہ توکل نہیں ہے توکل کے یہ معنی نہیں کہ اسباب و تدابیر کو قطعاً ترک کردیا جائے بلکہ طریقہ حقہ یہ ہے (۳) کہ تدبیر و تقدیر دونوں کو ملایا جائے یعنی کام کرکے توکل کرنا چاہئیے ؎

گر توکل مکینی در کارکن کسب کن پس تکیہ برجبار کن (۴)

دنیا میں بھی ہم یہی کہتے ہیں کہ کھیتی کرکے ثمرہ کے متعلق خدا تعالیٰ پر نظر رکھو (۵)۔

خلاصہ یہ ہے کہ عمل میں تو اسباب کو اختیار کرو اور ثمرہ میں توکل کرو چنانچہ دنیوی معاملات میں سب کا یہی طرز ہے مگر نہ معلوم یہ تجزیہ کیسا ہے کہ امور اخرویہ میں عمل اور ثمرہ دونوں میں توکل سے کام لیتے ہیں حالانکہ وہاں بھی یہی طریقہ

(۱) رزق اگرچہ ایسی جگہ سے ملتا ہے جس کی توقع بھی نہیں ہوتی لیکن کوشش کرنا تو شرط ہے (۲) اگرچہ کوئی موت آنے سے پہلے نہیں مرتا لیکن خود سے سانپ کے منہ میں تو نہ جائے (۳) صحیح طریقہ یہ ہے (۴) اگر توکل کرنا چاہتے ہو تو کام کرنے میں کرو پہلے تدبیر کرو پھر اللہ پر بھروسہ کرو (۵) کھیتی کرنے کے بعد پہلی آنے کے لئے اللہ پر بھروسہ کرو (۶) یہ کیسی تقسیم ہے کہ آخرت کے بارے میں عمل اور نتیجہ دونوں میں توکل کرتے ہیں۔

اختیار کرنا چاہئیے تھا جو معاملات دنیویہ میں اختیار کر رکھا ہے ورنہ دونوں میں فرق بتلانا چاہئے بلکہ اگر غور کیا جائے تو دنیا و آخرت کا فرق اس کو مقتضی ہے کہ مقاصد دنیویہ میں تو ترک تدبیر و تعطیل اسباب کی گنجائش ہے (۱) اور مقاصد اخرویہ میں ترکِ تدبیر و تعطیل اسباب کی مطلق گنجائش نہیں (۲)۔

ترک اسباب کا جواز وعدم جواز

کیونکہ توکل بمعنی ترک اسباب کی حقیقت ہے ترک اسباب مظنونہ غیر مامور بہا یعنی جن اسباب پر مسبب کا ترتب عادۃً یقینی وقطعی نہ ہو اور شرعاً وہ واجب بھی نہ ہوں ان کو ترک کر دیا جائے باقی جن اسباب پر عادۃً مسببات کا ترتب یقینی ہے ان کا ترک جائز نہیں (۳) مثلاً عادۃً کھانا کھانے پر شبع (۴) کا ترتب یقینی ہے اور پانی پینے پر سیرابی کا ترتب قطعی ہے اس کا ترک جائز نہیں اور نہ اس کو توکل کہا جائیگا کہ بھوک کی حالت میں آپ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں کہ اللہ میاں کو منظور ہوگا تو پیٹ خود بخود بھر جائیگا اگر یہ شخص بھوکوں مر گیا تو عاصی ہوگا (۵) اور اسباب مظنونہ کا ترک بھی اس شخص کو جائز ہے جو خود بھی قوی الہمت ہو اور اس کے اہل و عیال بھی یا اس کے اہلِ وعیال ہی نہ ہوں اور ضعیف الہمت کو یا جس کے عیال ضعیف ہوں اس کو ان کا ترک بھی جائز نہیں اسی طرح اسباب مامور بہا کا ترک توکل نہیں جب توکل کی حقیقت معلوم ہوگئی۔

---

(۱) تدبیر کو چھوڑنے اور اسباب کو اختیار کرنے کی گنجائش ہے (۲) آخرت کے بارے میں تدبیر نہ کرنے اور اسباب اختیار نہ کرنے کی بالکل اجازت نہیں (۳) جن اسباب پر مسبب یقینی طور پر مرتب نہ ہو اور شریعت نے ان کا حکم بھی نہ دیا ہو ان کو ترک کر سکتے ہیں جن پر ترتب یقینی ہے یا شریعت نے حکم دیا ہے ان کو نہیں چھوڑ سکتے (۴) پیٹ بھرنا (۵) گناہگار۔

اعمال دنیویہ اور اعمال اخرویہ میں فرق

تو اب سوچئے کہ ثمرات آخرت کے لئے جو اسباب شریعت نے بیان کیئے ہیں وہ کیسے ہیں آیا مامور بہ ہیں یا نہیں سو ظاہر ہے کہ مامور بہ ہیں اور نیز آیا ان پر مسبب کا ترتب شرعاً ضروری ہے یا مظنون ہے تو نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ اسباب آخرت پر ترتب مسبب لازم ہے چنانچہ ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا﴾ (۱) اور ارشاد ہے: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾ (۲) اور بہت سی صریح نصوص ہیں جن میں اعمال آخرت کی متعلق صریح وعدہ ہے کہ جزاء ضرور مرتب ہوگی اور دنیا کے متعلق نہ وعدہ ہے نہ اکثر اسباب میں ترتب ضروری ہے گو ہر چیز کے لئے اسباب موجود ہیں چنانچہ حدیث میں ہے (ما جعل الله داء الا جعل له دواءً) (۳) اور اسی واسطے تدبیر مشروع ہے مگر ان پر ثمرہ مرتب ہونے کا حق تعالیٰ کی طرف سے نہ وعدہ ہے اسی لئے کبھی تخلف بھی ہوجاتا ہے کہ کھیتی کرتے ہیں اور پیداوار نہیں ہوتی دوا کرتے ہیں اور شفا نہیں ہوتی۔ اور نہ اس پر عادۃً ترتب اثر ضروری ہے، اور نہ یہ شرط ہے کہ بدون دوا کے صحت نہ ہوسکے، یا جب دوا کی جائے تو صحت ضرور ہوجائے، بخلاف اعمال آخرت کے، کہ ان کو اپنے ثمرات کے ساتھ علیت وشرطیت دونوں کا علاقہ ہے۔ گو یہ علیت وشرطیت عقلی نہ ہو شرعی ہی ہو۔ تو لزوم ترتب میں اعمال آخرت کی وہ حالت ہے جو دنیا میں بعض اسباب قطعیہ یقینیہ کی حالت ہے جن پر عادۃً

---

(۱) سورۂ نساء: ۱۲۴ (۲) ''جس نے ذرہ برابر نیکی کی اس کو دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی اس کو دیکھے گا سورہ الزلزال'' سورۂ الزلزال: ۷۔۸ (۳) اللہ نے ہر بیماری کی دوا پیدا فرمائی۔

ترتب اثر ضروری ہے جیسے اکل پر شبع (۱) کا اور شرب پر سیری (۲) کا مرتب ہونا بلکہ وعدہ عدم وعدہ کے تفاوت سے اعمال آخرت ان اسباب سے بھی الصق ہیں (۳) پس جیسے ان اسباب کو دنیا میں ترک کرنا جائز نہیں یہی حکم جملہ اسباب آخرت کا ہے کہ ان میں سے کسی کا بھی ترک جائز نہیں کیونکہ وہ سب اسباب قعطیہ یقینیہ ہیں جن پر ترتب اثر کا نص میں وعدہ بھی ہے۔ پھر حیرت ہے کہ جن اسباب پر ترتب اثر کا وعدہ بھی نہیں وہاں تو چھوٹی سی چھوٹی تدبیر سے بھی دریغ نہیں اور جہاں ترتب ثمرہ کا وعدہ ہے کہ تخلف کا احتمال ہی نہیں وہاں توکل اختیار کرلیا ہے۔ پس دنیا وآخرت کے فرق پر نظر کی جائے تو اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیئے کہ دنیا کے تو بعض اسباب میں توکل جائز ہو اور آخرت کے کسی سبب میں بھی توکل جائز نہ ہو یہ تو اسباب کا حکم تھا۔

ثمرات ونتائج میں توکل

رہے مسببات اور ثمرات تو ان میں مطلقاً توکل واجب ہے خواہ ثمرۂ دنیا ہو یا ثمرۂ آخرت یعنی ثمرات کو اسباب کا نتیجہ نہ سمجھے خدا تعالیٰ کی عطا سمجھے خوب سمجھ لو بہرحال اسباب آخرت میں چونکہ تخلف نہیں ہے (۴) اس لئے ان کا ترک جائز نہیں۔ گو بعض لوگ بدوں (۵) عذاب کے بھی نجات پاجائیں گے مگر یہ محض فضل ہے جو قاعدہ سے باہر ہے اور حقیقت میں اس میں بھی تخلف نہیں کیونکہ وہاں وعید مقید ہے (۶) پس خلف وعید ہی نہ ہوا پھر یہ کہ آپ کے پاس کیا ایسے لوگوں کی کوئی فہرست ہے جو بدون عذاب کے خلاف قاعدہ ظاہری بخشے جائیں گے؟ تو اس کا کیونکر اطمینان کرلیا گیا آپ اُسی فہرست میں داخل ہیں اور ان لوگوں میں داخل

(۱) کھانے بھوک مٹنا (۲) پینے سے پیاس ختم ہونا (۳) ملے ہوئے (۴) اسباب آخرت میں ایسا نہیں ہے کہ آپ سبب اختیار کریں اور اس پر نتیجہ مرتب نہ ہو (۵) بغیر عذاب (۶) وعید میں قید ہے پس اسی وعید کا خلاف نہیں ہوا۔

نہیں جن سے قاعدہ اور ضابطہ کا معاملہ کیا جائیگا۔

قدرت کاملہ کا اظہار

دوسری بات یہ ہے کہ گو بعض عصاۃ کی مغفرت بدوں تعذیب کے بھی ہوگی(۱) مگر احتمال یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں گاہے گاہے(۲) اظہار قدرت کاملہ کے لئے بدوں اسباب عادیہ کی مسبب کا وجود ہوجاتا ہے جیسے آدم علیہ السلام وحوا علیہا السلام کا بدوں ماں باپ کے پیدا ہونا اور حضرت عیسی علیہ السلام کا بدون باپ کے ہونا مگر ایسا شاذو نادر ہے(۳) عادت غالبہ یہی ہے کہ بدون اسباب عادیہ کی مسبب کا ترتب نہیں ہوتا(۴) ایسا ہی احتمال ہے کہ شاید آخرت میں بھی ہو کہ زیادہ تر فیصلہ نجات کا اسباب واعمال پر ہو اور بعض کو قدرت خداوندی واختیار کامل ظاہر کرنے کے بدوں اسباب کے نجات ہوجائے البتہ ایک سبب کا وجود پھر ضروری ہے یعنی ایمان کا گو حق تعالیٰ اس پر بھی قادر ہیں کہ بدوں وایمان کے بھی بخشدیں اور اگر نص قطعی ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ (۵) نہ ہوتی تو ہم اس کے بھی قائل ہوجاتے کہ شاید بدوں ایمان کے بھی مغفرت ہوجائے مگر نص قطعی کے بعد اس کے قائل نہیں ہوسکتے پس یہ سبب تو ضروری ہے کہ ایمان حاصل ہو باقی دیگر اعمال کے بارے میں ہمارا یہی عقیدہ ہے کہ وہ اسباب اکثریہ ہیں وہاں تخلف ممکن ہے، اور صرف ممکن ہی نہیں بلکہ اس کا وقوع بھی ہوگا کہ باوجود معاصی کے بعض لوگ بدوں عذاب کے بخشدیئے جائیں گے مگر اول تو یہ خبر نہیں کہ ایسا کثرت سے ہوگا شاید کم ہو۔ پھر اس کے بھروسہ پر عمل

(۱) بعض گناہگاروں کی مغفرت بغیر عذاب کے ہوگی (۲) کبھی کبھی (۳) بہت کم ایسا ہوتا ہے (۴) عام عادت یہی ہے کہ بغیر اسباب کے سبب نہیں پایا جاتا (۵) ''اللہ تعالیٰ اس بات کو معاف نہیں کرینگے کہ اس کے ساتھ شریک کیا جائے اس کے علاوہ سب بخشدیں گے'' سورۂ نساء:۴۸۔

سے کیونکر بیٹھ سکتے ہیں اس کی تو وہی مثال ہوگی کہ کوئی شخص بدوں نکاح کے اولاد کا متمنی ہو اور نظیر میں آدم علیہ السلام وحوا علیہا السلام کا واقعہ پیدائش بیان کرے یا کوئی عورت بدوں خاوند کے اولاد کی خواہشمند ہو اور مثال میں مریم علیہا السلام کی نظیر بیان کرے سب لوگ ان کو احمق کہیں گے آخر کیوں؟ اسی واسطے تاکہ یہ واقعات شاذ و نادر بطور خرق عادت کے ہوئے تھے(۱) اور عادت غالبہ اس کے خلاف ہے اسی طرح مغفرت بدوں تعذیب کی خبر سن کر اعمال سے بے فکر ہو جانا بھی حماقت ہے، اور اگر مان لیا جائے کہ اس کا وقوع بھی کثرت سے ہوگا تو آپ کے پاس ایسے لوگوں کی فہرست تو نہیں ہے پھر کیا اطمینان ہے کہ آپ انہی میں سے ہیں یا دوسروں میں سے اور یہ تخلف ظاہری اسباب سے عصاۃ کے لئے تو ہوگا کہ باوجود معاصی کے نجات ہو جاوے گی متقین کے لئے نہ ہوگا کہ باوجود طاعات کے نجات نہ ہو۔

حدیث کی تشریح

اور اگر اعمال کی مسببیت کے متعلق کسی کو اس حدیث سے شبہ ہو، ان الرجل یعمل بعمل اهل الجنة حتی لایبقی بینه و بینها الا قدر ذراع فیسبق علیه القدر فیکون من اهل النار او کما قال۔ (۲) کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض دفعہ کوئی شخص باوجود اعمال صالحہ کے پھر بھی محض تقدیر کے غلبہ سے دوزخی ہو جاتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جبراً وقہراً کسی (۳) کو دوزخی نہیں بنایا جاتا اور نہ حدیث کا یہ مطلب ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ بعض آدمی ابتداء میں اعمال صالحہ اختیار کرتا ہے حتی کہ جنت سے قریب ہو جاتا ہے اور انتہاء میں اپنے قصد و ارادہ

(۱) یہ واقعات بہت کم اور خلاف عادت ہوئے ہیں (۲) کوئی شخص جنتی لوگوں کے سے اعمال کرتا ہے حتی کہ اس کے اور جنت کے مابین صرف ایک ہاتھ کے بقدر فاصلہ رہ جاتا ہے کہ اس پر تقدیر غالب آجاتی ہے اور وہ دوزخیوں میں سے ہو جاتا ہے۔ یا جیسا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (۳) زبردستی۔

واختیار سے اعمال سیئہ پر کمر باندھ لیتا ہے اور جہنمی ہوجاتا ہے یہ مطلب نہیں کہ بدوں قصد واختیار کے اضطراراً اس سے اعمال سیئہ صادر (۱) ہونے لگتے ہیں کیونکہ عمل اضطرار (۲) سے کوئی شخص معذب نہیں ہوسکتا مضطر کو شریعت نے معذور کہا ہے اور اس سے مؤاخذہ نہیں کیا جاتا پس فیسبق علیه الکتاب کا (۳) کا یہ مطلب ہے ہرگز نہیں کہ وہ بھی اختیار جبراً معصیت کرنے لگتا ہے کیونکہ یہ معصیت ہی نہیں اکراہ واضطرار میں معصیت تو معصیت اجراء کلمۂ کفر پر بھی مواخذہ نہیں ہوتا (۴)۔

بداعمالیوں کے سبب جہنم میں داخلہ

میں خدائی قسم کھا کر کہتا ہوں اور قسم سے زیادہ اطمینان دلانے کا میرے پاس اور کیا ذریعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عذاب کے لئے بہانہ نہیں ڈھونڈتے ہاں رحمت کے لئے البتہ بہانہ ڈھونڈتے ہیں خدا کی قسم جو کوئی جہنم میں جائیگا اپنی کرتوتوں سے جائیگا بلاوجہ کسی کو عذاب نہ دیا جائیگا بلکہ بندہ پر حجت تمام کرکے جہنم میں بھیجا جائیگا اور وہاں انسان کو خوب معلوم ہوجائیگا کہ اعمال شر اور معصیت میں وہ مجبور نہ تھا گو یہاں کیسی ہی باتیں بنائے اور یہاں بھی دوسروں ہی کے سامنے باتیں بنائی جاتی ہیں۔ اپنے دل میں ہر شخص جانتا ہے کہ وہ گناہ ارادہ سے کرتا ہے یا بے ارادہ اور مضطر ہوکر کرتا ہے یا مختار ہوکر یقیناً معصیت کے وقت اس کے ضمیر میں دونوں پہلوں آتے ہیں اور تھوڑی دیر تک وہ ضرور متردد ہوتا ہے کہ یہ کام کروں یا نہ کروں پھر اپنی اختیار سے ایک شق کو لے لیتا ہے ﴿ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ۙ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ ﴾۔ (۵)

(۱) برے اعمال کا اظہار ہونے لگتا ہے (۲) غیر اختیاری عمل پر کسی کو عذاب نہیں ہوتا (۳) اس پر نوشتہ تقدیر غالب آجاتا ہے (۴) جبرا تو گناہ تو گناہ زبان سے کلمہ کفر کہنے سے بھی مواخذہ نہیں ہوتا

(۵) سورۂ قیٰمہ: ۱۴۔۱۵۔

شبہ کا جواب

اسی طرح اعمال کی سببیت کے متعلق اس حدیث سے بھی شبہ نہ کیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے لا یدخل الجنة احد بعمله کہ اپنے عمل سے جنت میں کوئی نہ جائیگا صحابہ نے عرض کیا ولا انت یا رسول اللہ (اور کیا آپ بھی نہیں یارسول اللہ) ولا انا الا ان یتغمدنی الله برحمته ہاں میں بھی نہیں مگر یہ کہ حق تعالیٰ اپنی رحمت سے ڈھانپ لیں۔ اس سے شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ یہ حدیث تو ساری تقریر کو رد کر رہی ہے اور اس میں تو سببیت عمل کی صراحۃً نفی ہے کہ عمل کو دخولِ جنت میں کوئی دخل نہیں بلکہ اس کا مدار محض فضل و رحمت پر ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ حدیث کا مطلب نہیں سمجھے۔ میں تفسیر حدیث سے پہلے ایک مثال بیان کرتا ہوں مثلاً کسی شخص کو ایک گھنٹہ کا کام دیا جائے کہ وہ ایک گھنٹہ تک پیر دبایا کرے اور اس کے عوض میں اس کو ہزار روپے ماہوار دیئے جائیں اور آقا یوں کہے کہ اس کے عمل میں تو کچھ قوت اور قابلیت ایسی نہیں کہ اس کو ہزار روپے ماہوار دیئے جائے یہ تو محض ہماری عنایت ہے۔ تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ ایک گھنٹہ کی خدمت بیکار ہے اور کیا اس راز کو سن کر اس شخص کو ایک گھنٹہ کی خدمت ترک کر دینا چاہیئے؟ اگر وہ ایسا کرے گا تو احمق ہوگا کیونکہ گو ہزار روپے ماہوار اس عمل کا معاوضہ نہیں بلکہ محض عنایت ہے، مگر وہ عنایت اسی ایک گھنٹہ کی بدولت ہو رہی ہے اگر یہ اس خدمت کو ترک کر دیگا تو نہ معاوضہ ملے گا نہ عنایت ہوگی دونوں سے کورا ہو جائیگا ﴿خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ﴾(۱)

عمل کی اہمیت

اب حدیث کا مطلب سمجھئے آپ کا مطلب بھی یہی ہے کہ جنت میں جو

(۱) ''دنیا اور آخرت دونوں میں خسارے میں اور یہی کھلا خسارہ ہے'' سورۂ حج: ۱۱۔

مؤمن کو اتنی بڑی سلطنت ملے گی جس کی شان یہ ہوگی ﴿وَاِذَا رَاَیْتَ ثَمَّ رَاَیْتَ نَعِیْمًا وَّمُلْکًا کَبِیْرًا﴾ (۱) اور سچ کی حالت یہ ہے (اعددت لعبادی الصالحین ما لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر) (۲) اس سلطنت کے حصول کے لئے یہ عمل کیا چیز ہے جو ہم کر رہے ہیں اتنی بڑی جزا یہ محض عنایت ہے لیکن یہ عنایت ہوگی اسی عمل کی بدولت گو وہ ناچیز ہے اور اس جزا کے سامنے کچھ بھی نہیں یہ مطلب نہیں کہ عمل بیکار ہے۔ آسان عنوان اس کے سمجھنے کا یہ ہے کہ اس حدیث میں دخول جنت کا سبب رحمت کو بتلایا گیا ہے اب نصوص (۳) میں غور کرلو کہ موردِ رحمت کون ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ رحمت حق نیکوکاروں سے قریب ہے اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ جس رحمت سے دخول جنت ہوگا وہ رحمت اسی عمل قلیل وعمل ناقص وعملِ حقیر پر مرتب ہوگی (۴) جو جنت کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہیں رکھتا اگر عمل بیکار چیز ہے تو حضور ﷺ نے بعض اعمال پر حدود کیوں جاری کیں اور نصوص میں اعمال سیئہ پر وعید کیوں ہے اور اعمال صالحہ پر وعدہ کیوں ہے تو کیا یہ نصوص محض لغو ہیں؟ نعوذ باللہ ہرگز نہیں۔

غلط فہمی کا ازالہ

اب آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ لوگ آجکل کتنی بڑی غلطی میں مبتلا ہیں بار بار لوگوں کی زبان پر یہ بات آتی ہے ؎

اب تو آرام سے گذرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے

شاعر نے حصر کردیا ہے کہ عاقبت کی خبر خدا تعالیٰ ہی کو ہے ہم کو کچھ خبر

(۱) سورۂ الدھر: ۲۰ (۲) میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے جنت میں وہ نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا نہ کسی کے دل میں اسکا خیال ہی گذرا (۳) قرآن وحدیث (۴) اس تھوڑے سے نامکمل ناقابل اعتبار عمل پر وہ رحمت مرتب ہوگی۔

نہیں ہوسکتی یہ حصر غلط ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بلاواسطہ خبر تو حق تعالیٰ کو ہے لیکن حق تعالیٰ کے بتلانے سے ہم کو بھی خبر ہے پس ہم جواب میں یوں کہتے ہیں کہ عاقبت کی اصل خبر خدا کو ہے اور خدا تعالیٰ کے بتلادینے سے ہم کو بھی خبر ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے حکیم ایک دوا کی نسبت یہ کہے کہ یہ زہر ہے اور آپ یوں کہیں کہ بھائی حکیم ہی جانے کہ زہر کون کون ہے مگر یہ کہہ کر آپ سنکھیا (۱) کھا نہیں لیتے بلکہ یہی کہتے ہیں کہ بھائی جب حکیم نے بتلادیا کہ یہ زہر ہے تو ہم کو بھی خبر ہوگئی اب اسکا کھانا حماقت ہے اسی طرح آخرت کے معاملہ میں کیوں نہیں کہا جاتا کہ جن چیزوں کو حق تعالیٰ نے آخرت کے لئے مفید فرمایا ہے ان کو اختیار کرو اور جن کو مضر بتلایا ہے ان کو چھوڑ دو آخرت کے متعلق مفید و مضر کا (۲) علم تو حق تعالیٰ کے بتلانے سے ہم کو بھی ہے پھر اُس سے مطلق بے خبری کا دعویٰ کیوں کیا جاتا ہے؟۔

اعمال میں کوتاہی

غرض مجھے اس وقت اس امر کی شکایت ہے کہ جس طرح ہم کو دنیا کے اسباب و مسببات میں ربط کا اعتقاد ہے اس طرح آخرت کے اعمال و ثمرات میں ربط کا اعتقاد نہیں۔ بس جو لوگ کچھ کرتے بھی ہیں ایک بے ربط حکم سمجھ کر کرتے ہیں یہ نہیں سمجھتے کہ اس نماز پر دخولِ جنت مرتب ہوگا اس خیال عدم ارتباط نے ہمارے اعمال کا ناس کردیا ہے بعض تو اعمال کی فکر ہی نہیں کرتے اور بعض اعمال بجالاتے بھی ہیں تو ان میں تکمیل و تعدیل کا اہتمام نہیں کرتے (۳) کیونکہ اگر وہ دوا کی طرح ان اعمال کو سبب نجات سمجھتے تو جیسے دوا میں تدبیر کامل کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ کوئی دوا رہ نہ جائے اور کوئی دوا وزن سے کم نہ ہو اسی طرح یہاں بھی اہتمام ہوتا کہ عمل

(۱) زہر (۲) نقصان دہ (۳) کامل طریقہ سے تعدیل ارکان کے ساتھ نماز کا اہتمام نہیں کرتے۔

کے سب ارکان و آداب بجالائے جاتے اور ہر چیز کو خوبی کے ساتھ ادا کیا جاتا۔ صاحبو! اگر ہم سواری لیا کرتے ہیں تو ایسی لیتے ہیں جس سے منزل پر پہنچ جائیں پھر یہاں نماز ایسی کیوں نہیں ادا کرتے جو جنت میں پہنچادے۔

آخرت کا سکہ

اگر کوئی بازار میں جاتا ہے تو ایسا سکہ لے جاتا ہے جو بازار میں چل سکے گھسی ہوئی اور خراب دونی چونی(۱) کوئی نہیں لے جاتا کیونکہ جانتا ہے کہ اس سے سودا نہ ملے گا پھر نماز کو ایسا سکہ کیوں نہیں بناتے جو بازار آخرت میں چل جائے یہاں اس کے کھری اور عمدہ بنانے کی تدبیر کیوں نہیں کی جاتی بس یہی تو فرق ہے کہ دنیا کے بازار میں تو آپ دونی چونی کو سکہ اور سودے کی قیمت سمجھتے ہیں اور نماز وروزہ کو بازار آخرت کا سکہ اور جنت کی قیمت نہیں سمجھتے یہی غلطی ہے اور اسی پر میں اس وقت متنبہ کرنا چاہتا ہوں اور اسی سے غفلت کی شکایت ہے۔ صاحبو! کیا یہ واقعات بھلانے کے قابل ہیں کہ ہم کو پل صراط پر چڑھنا ہے حشر کے میدان میں کھڑا ہونا ہے جو نہایت سخت دن ہوگا افسوس ہم کو پھانسی پر چڑھنا تو ہے اور اترنے کی خبر نہیں ؎

چوں چنیں کا ریست اندر رہ ترا خواب چوں می آید اے ابلہ ترا(۲)

ہم کیسے غافل ہیں نہ معلوم ہم کو نیند کیسے آتی ہے میرا یہ مطلب نہیں کہ نیند بھی نہ آنا چاہیے بلکہ مطلب یہ ہے کہ غفلت کی نیند نہ آنا چاہئے ورنہ اگر نیند بالکل نہ آوے تو علاوہ دنیوی کاموں کے ہمارے دین کے کام بھی خراب ہوجائیں تو یہ خدا تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ کیفیت و حال کا اتنا غلبہ ہمارے اوپر نہیں کیا جو نیند ہی اڑ جائے ورنہ واقعی جو حالات ہمارے سامنے ہیں وہ ایسے ہی سخت ہیں کہ اگر ہر

(۱) ایک روپیہ میں چار چونی اور آٹھ دونی اور سولہ آنے ہوتے تھے اب نہیں ہوتے (۲) ایسے عظیم کام میں مشغولیت کے وقت اے بیوقوف تجھے نیند کیسے آگئی۔

وقت پیش نظر رہیں تو نیند بھی اڑ جائے اور کھانا پینا بھی چھوٹ جائے۔ لیکن حق تعالیٰ نے حضور وغیبت کا فرق قائم کر رکھا ہے(۱) جس سے دنیا کے اور دین کے سارے کام چل رہے ہیں ورنہ سب کارخانے معطل ہوجاتے مگر اتنی غفلت بھی حق تعالیٰ کو گوارا نہیں جیسی اب ہے۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم پر غلبہ خوف

حدیث میں ہے کہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ حضرت صدیق کو راستہ میں ملے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے مزاج پوچھا کہا نافق حنظلۃ کہ حنظلہ (یعنی میں) تو منافق ہوگیا پوچھا یہ کیسے کہا اس واسطے کہ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا جنت و دوزخ ہمارے سامنے ہیں اور پھر جب وہاں سے اُٹھ کر اپنے بال بچوں میں آتے ہیں اور دنیا کے مشاغل میں لگتے ہیں تو وہ حالتِ حضور نہیں رہتی (اور یہی نفاق ہے) حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا گر یہ نفاق ہے تو اس میں تو ہم بھی مبتلا ہیں چلو اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض معروض کریں چنانچہ حاضر خدمت ہوئے اور شبہ عرض کیا حضور نے فرمایا اے حنظلہ اگر تم ہر وقت ویسے ہی رہو جیسے میرے سامنے رہتے ہو تو ملائکہ تم سے مصافحہ کیا کرتے اور تم جنگلوں کو چڑھ جاتے ولکن یا حنظلة ساعة فساعة لیکن اے حنظلہ ایک وقت ایسا ہے اور ایک وقت ویسا ہے) یہ تو حدیث ہے بعد میں علماء نے اس کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ مثلاً خوف کا ایک درجہ تو یہ ہے کہ محض خوف کا غلبہ ہو تو غلبۂ خوف سے تعطل ہوجاتا ہے اور تعطل سے ترقی نہیں ہوتی اور مقصود بھی حاصل نہیں ہوتا جیسے بعضا بچہ امتحان کے وقت غلبۂ خوف سے سب پڑھا پڑھایا یاد کیا ہوا بھول جاتا ہے۔

(۱) مشاہدہ اور غیر مشاہدہ کا فرق قائم رکھا ہے۔

درجات خوف

خلاصہ یہ ہے کہ ایک درجہ غلبۂ خوف کا یہ ہے جس سے سارے مصالح فوت ہوجائیں محض خوف ہی خوف باقی رہ جائے یہ درجہ مطلوب نہیں اور ایک درجہ غلبۂ خوف کا وہ ہے جس کے ساتھ دوسرے مصالح باقی رہیں مگر وہ سب تابع ہوں اور خوف سب پر غالب رہے۔ یہ درجہ مطلوب اور محمود ہے۔

درجات شوق

اسی طرح غلبۂ شوق کا ایک درجہ یہ ہے کہ کسی کو محبوب سے ایسا عشق ہوجائے کہ سب مصالح فوت ہوجائیں نہ کھانے کا نہ پینے کا نہ نماز کا نہ روزہ کا بس ہر وقت ایک ہی دھن میں رہے یہ درجہ تو مطلوب نہیں اور ایک درجہ یہ ہے کہ محبت وشوق کے ساتھ دوسرے مصالح بھی محفوظ رہیں کھاتا پیتا بھی رہے کاروبار میں بھی لگا رہے مگر ہر حالت میں محبوب کی یاد رہتی ہے یہ غلبہ مطلوب ہے۔

شوق وخوف میں درجہ مطلوب

پس حضور ﷺ کا مطلب یہ ہے کہ غلبہ خوف اور محبت دونوں میں مقصود وہ درجہ ہے جس کے ساتھ دوسرے مصالح بھی فوت نہ ہوں اور یہ جب ہی ہوسکتا ہے جبکہ ہر حال میں یکساں غلبہ نہ ہو بلکہ ایک وقت میں تو محض خوف اور محبت ہی کا غلبہ ہو اور کسی کام کی طرف التفات نہ ہو اور ایک وقت میں دوسرے کاموں کی طرف بھی التفات ہو مگر دل میں خوف اور محبت کی وجہ سے آرہ بھی چل رہا ہو جیسے طاعون کے زمانہ میں موت کا غلبہ ہر وقت رہتا ہے مگر ایسا نہیں ہوتا کہ کھانا پینا بھی چھوٹ جائے نیند نہ آوے یا دنیا کے کاروبار بند ہوجائیں نہیں بلکہ کھاتے بھی ہیں

پیتے بھی ہیں سوتے بھی ہیں مگر بے فکری نہیں ہوتی بس یہی حالت مطلوب ہے اور عارفین کو بھی غلبہ حاصل ہوتا ہے اور یہی مطلوب ہے۔ اسی حالت کے حاصل کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: (اکثروا ذکرھا ذم اللذات) یعنی موت کی یاد کی کثرت کرو یعنی اس کو غالب رکھو ویسا ہی غلبہ جیسا طاعون کے زمانہ میں ہوتا ہے دوسری جگہ ارشاد ہے (صل صلوۃ مودع) یعنی نماز ایسی پڑھو جیسے دنیا کو رخصت کرنے والا نماز پڑھا کرتا ہے۔ یعنی اگر کسی کو یہ معلوم ہوجائے کشف سے یا کسی صاحب کشف بزرگ کے ارشاد سے کہ ہماری زندگی صرف اتنی باقی رہ گئی ہے کہ اس میں ایک ہی نماز پڑھ سکتے ہیں تو بتلایئے اس وقت کیسی نماز پڑھی جائیگی یقیناً ایسی پڑھی جائیگی کہ عمر بھر بھی ایسی نماز نہ پڑھی ہوگی۔ ہر ہر لفظ کو صاف صاف الگ الگ ادا کیا جائیگا کہ ایسا نہ ہو الفاظ لپٹ جائیں سبحان ربی العظیم بھی الگ الگ تین دفعہ گن کر کہیں گے اور ہر رکعت کو بھی اچھی طرح یاد رکھیں گے یہ نہیں کہ دو رکعت پڑھ کر شبہ ہورہا ہے کہ یہ دوسری ہے یا چوتھی غرض ہر رکن و اعتدال اور تکمیل سے ادا کیا جائیگا اول تو انشاء اللہ ہر شخص قاری ہوجائیگا اور قاری بھی نہ ہو تو الفاظ تو صاف صاف ادا ہوں گے اور ہر رکن میں یہ خیال غالب رہے گا کہ بس اب خدا سے ملنا ہے یہ نماز ایسی تو ہو جو ان کے سامنے پیش ہوسکے وساوس وخطرات بھی کافور ہوجائیں گے (۱) میں یہ نہیں کہتا کہ خیالات بالکل نہ آوینگے۔ اگر آویں گے جیسے بہتے دریا میں تنکے اور بلبلے ہوتے ہیں کہ ادھر آیا ادھر گیا ادھر اٹھا ادھر بجھا۔ وہ جمنے نہ پاوینگے اور یہی مطلوب ہے۔

وساوس اختیاری اور غیر اختیاری کا حکم

خیالات کا انقطاع کلی مطلوب نہیں وساوس وخطرات بلا قصد (۲) تو مرتے

(۱) وسوسے بھی نہیں آئینگے (۲) بغیر ارادہ۔

دم تک بھی آویں تو خوف کی چیز نہیں کیونکہ حدیث میں ہے (ان اللّٰہ تجاوز عن امتی ماحدث به انفسها)(۱) مگر یہ وہی خیالات ہیں جو خود آویں باقی خیالات کا لانا اور قصداً جمع کرنا یہ ﴿اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ (۲) میں داخل ہے اس پر مواخذہ ہوگا مثلاً غنا (۳) کا سننا ایک تو بے اختیار ہے کہ خواہ مخواہ کان میں آواز آرہی ہے مگر یہ قصداً اس طرف توجہ نہیں کرتا یہ تو معاف ہے اور ایک اس کی طرف التفات کرنا کان لگانا اس سے مزے لینا یہ حرام ہے بلکہ فقہاء نے لکھا ہے (التلذذ بها کفر)(۴) یہ بہت سخت کلمہ ہے جو زجراً استعمال کیا گیا ہے اسی طرح کسی عورت یا امرد کی طرف بلا ارادہ کے خیال پہنچ جاوے یہ معاف ہے ایک یہ کہ اس کی صورت کو سوچ سوچ کر یاد کرے یا اس سے تلذذ کرے یہ گناہ ہے اس سے بحث نہیں کس درجہ کا گناہ ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے کیونکہ صغیرہ کبیرہ کا وہ فرق جو صغیرہ پر جری کردے میں نے پہلے ہی رفع کردیا ہے کیونکہ دین کو تباہ کرنے کو دونوں کافی ہیں اسی طرح نماز میں قصداً خیال لانا برا ہے اور بلا قصد کے وساوس کا آنا مضر نہیں اب تو ہماری نماز میں قصداً خیال لائے جاتے ہیں بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک خیال آیا تو بے اختیار مگر اس کو دیر تک باقی رکھتے ہیں ابقاء وساوس بھی امر اختیاری ہے (۵) اس پر بھی ملامت کی جاوے گی آجکل تو ہماری نماز ساری حسابات کا محل ہے دنیا بھر کے حسابات اُسی میں ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ حساب کے لئے یکسوئی کی ضرورت ہے اب نماز میں سارے حساب اس لئے ہوتے کہ ہم کو اس کی تو مشق ہوگئی ہے اس لئے نماز کے ارکان واذکار ادا کرنے

(۱) میری امت سے وساوس پر مواخذہ نہیں کیا جائے گا (۲) ''دل میں پوشیدہ اختیاری خیالات کو چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ اس کا حساب لیں گے'' سورۂ بقرہ:۲۸۴ (۳) گانا سننا (۴) اس سے لذت حاصل کرنا یہ کفر ہے (۵) وسوسوں کو باقی رکھنا بھی فعل اختیاری ہے۔

کے لئے تو توجہ کی ضرورت نہیں رہی وہ تو خود بخود ادا ہوتے رہتے ہیں جیسے گھڑی کوک (۱) بھرنے کے بعد خود بخود چلتی رہتی ہے تو اس میں یکسوئی پوری ہوتی ہے اس لئے سارے وساوس اُسی میں آتے ہیں۔

ہماری نماز کی مثال

نماز کی مشق پر ایک حکایت یاد آئی ایک کچہری میں معمول تھا کہ ظہر کی نماز کے وقت نماز کے لئے کچھ دیر کو اجازت دے دی جاتی تھی تو سارے مسلمان اس وقت کچہری سے چلے جاتے تھے نمازی بھی اور بے نمازی بھی نمازی تو نماز کے لئے اور بے نمازی شرما شرمی تاکہ حکام ان کو بے نمازی نہ کہیں تو ایک صاحب جو بے نمازی تھے وہ کچہری سے تو سب کے ساتھ چلے جاتے اور سب سے پہلے واپس آجاتے اور دوسرے دیر میں آتے ایک دن حاکم نے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ فلاں شخص دیر میں آتے ہیں اور تم جلدی چلے آتے ہو کیا تم نماز نہیں پڑھتے؟ تو آپ کہتے ہیں کہ نہیں حضور یہ بات نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ میں تو پرانا نمازی ہوں میرے آباؤ اجداد کئی پشت سے نمازی ہیں تو مجھے نماز کی مشق ہے اور فلاں صاحب نئے نمازی ہیں ان کو نماز کی مشق نہیں اس لئے سوچ سوچ کر اٹک اٹک کر پڑھتے ہیں۔

علاج وساوس

غرض نماز میں وساوس اسی لئے آتے ہیں کہ ہم اس کو مشق کے طور پر بے توجہی سے ادا کرتے ہیں ورنہ نماز تو ایسی چیز ہے جس میں سب سے زیادہ توجہ ہونا چاہئے تھی تو پھر اس میں حساب کتاب نہ ہوسکتا (لان النفس لا تتوجہ فی آن واحد الی شیئین) کہ نفس ایک آن میں دو طرف متوجہ نہیں ہوسکتا اگر ہم کو نماز کے

(۱) چابی دینے کے بعد۔

ارکان واذکار کی طرف توجہ ہو اور ہر رکن کو اور ہر لفظ کو ارادہ وقصد سے ادا کریں تو پھر دوسری طرف ہرگز توجہ نہ ہوسکے اور وساوس کا ہجوم نہ ہو باقی سہو اگر دوسرے اسباب سے ہو وہ اور بات ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں اسی کا طریقہ بتلایا ہے جس سے ہر رکن توجہ سے ادا ہو یعنی (صل صلوۃ مودع) اگر ہم کو یہ معلوم ہوجائے کہ یہ نماز ہماری اخیر نماز ہے اور یہ ایسی بات ہے جس کا احتمال ہر وقت ہے کیونکہ اس کی کسی کو خبر نہیں کہ ہماری کتنی عمر باقی ہے انسان کے اندر خود ہلاکت کا سامان ہر وقت تیار ہے چنانچہ کھانے پینے میں پھندا لگ جاوے تو کیا حال ہو بعض دفعہ تھوک نگلنے سے پھندا لگ جاتا ہے صفرا سودا(۱) کے اختلاف کو الگ رہنے دو جب بھی اس حدیث میں کچھ شبہ نہیں کہ ہر وقت میں موت کا احتمال ہے بعض واقعات ایسے ہوئے ہیں کہ بدوں کسی سبب ظاہری کے دفعۃً موت آگئی اطبا بعد میں اس کے اسباب گڑھتے رہتے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ عمر کے ختم ہونے کی کسی کو خبر نہیں شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود (۲) پس ایسی موت کا بڑا سبب یہ ہے کہ دن پورے ہوچکے تھے اس بات کو پیش نظر رکھنے کا اس حدیث میں امر ہے صل صلوۃ مودع (۳) بس یہ سوچ کر نماز پڑھو انشاء اللہ نماز میں قصداً تو ایک وسوسہ بھی نہ آئیگا اور جو آئیگا بھی تو بہت جلد فنا ہوجائے گا۔

موت وآخرت کی یاد کا استحضار

پھر چونکہ نماز میں کھڑے ہوتے ہوئے دفعۃً یہ حالت حاصل نہیں ہوسکتی اس لئے حضور ﷺ نے دوسری حدیث میں (اکثروا ذکرھا ذم اللذات)(۴) فرما کر ایسی بات بتلادی جس سے نماز میں موت کا مراقبہ سہل ہوجائے کیونکہ اس

(۱) انسان کے جسم میں چار خلط ہیں جن میں سے دو یہ ہیں صفراء زرد کڑوے پانی کو کہتے اور سوداء جلے ہوئے بلغم کو کہتے ہیں (۲) شاید کہ یہی سانس آخری سانس ہو (۳) نماز کو آخری نماز سمجھ کر پڑھو (۴) لذتوں کو فنا کرنے والی چیز موت کو کثرت سے یاد کرو۔

حدیث سے مقصود یہ ہے کہ زیادہ اوقات میں آخرت کو یاد رکھا کرو جب زیادہ اوقات میں اس کو یاد رکھا جائیگا تو نماز میں بھی اس کا استحضار(۱) سہل ہوجائیگا۔ سبحان اللہ رسول اللہ ﷺ کی نظر بھی کس قدر دقیق ہے کہ ہر بات میں ہر پہلو کی رعایت ہے اگر حضور صرف اتنا ہی فرماتے صل صلوۃ مودع تو اس پر یہ اشکال ہوسکتا تھا کہ دن بھر تو ہم دنیا کے مشاغل میں مشغول رہیں پھر نماز کے قلیل وقت میں آخرت کو کیونکر مستحضر (۲) کہیں یقیناً اس وقت وہی باتیں خیال میں آئیں گی جن کی طرف نماز سے پہلے متوجہ تھے مگر اکثر واذکر ھا ذم اللذات کو اس کے ساتھ ملا کر کوئی اشکال نہیں رہا پھر اس میں بھی یہ نہیں فرمایا کہ ہر وقت موت کو پیش نظر رکھو بلکہ لفظ اکثروا فرمایا کہ زیادہ اوقات میں اس کو یاد رکھا کرو اس پر تعطل کا(۳) شبہ بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ کچھ اوقات میں عدم ذکر کی بھی اجازت ہے اور یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس حدیث میں ھاذم اللذات کی تفسیر موت سے آئی ہے اس سے صرف موت ہی مراد نہیں کیونکہ وہ ذرا سی بات ہے کہ موت آئیگی اس سے لذات شکستہ نہیں ہوسکتیں بلکہ مراد ذکر موت و مابعد الموت (۴) ہے کیونکہ القرآن یفسر السنۃ والسنۃ تفسر القرآن ۔قرآن حدیث کی تفسیر کرتا ہے اور حدیث قرآن کی تفسیر کرتی ہے اور قرآن میں ارشاد ہے: ﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ﴾(۵) اور ﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ﴾(۶) اور ﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى﴾(۷) ان سب نصوص سے معلوم ہوا کہ حشر اور میدان قیامت کا یاد رکھنا اور حق تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کا استحضار بھی مطلوب ہے سو اس استحضار کے اکثار کا حکم فرمایا ادامت لغویہ(۸) کا حکم نہیں دیا کہ وہ بعض اوقات مفوت

(۱) پیش نظر رکھنا آسان ہوگا (۲) پیش نظر رکھیں (۳) بیکار ہونے کا (۴) موت کی یاد اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کا دھیان (۵) جو اپنے رب سے ملاقات کی امید رکھے (۶) سورۂ رحمٰن:۴۶ (۷) سورۂ النّٰزعات:۴۰ (۸) موت کو کثرت سے یاد کرنے کا حکم دیا ہمیشہ اسی کی دھیان میں رہنے کا حکم نہیں دیا۔

مصالح ہو جاتا ہے (۱) غرض غفلت ضعیفہ مضر (۲) نہیں مگر ہماری غفلت تو حد سے بڑھ کر درجہ مذمومیت (۳) تک پہنچ گئی اور یہی مانع ہو رہی ہے اصلاح اعمال سے (۴) اور آیت میں اسی کی شکایت ہے اگر یہ غفلت دور ہو جاوے تو انشاء اللہ سارے اعمال درست ہو جائیں چونکہ یہ نسخہ نہایت مفید تھا اس لئے جی چاہا کہ آپ کے کانوں میں بھی یہ مضمون پڑ جائے۔

اصلاح اعمال کی صورت

پس اصلاح اعمال کی صورت یہ ہے کہ ہر کام میں آخرت کو یاد رکھو اور یاد رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اعمال دو طرح کے ہیں ایک مفید آخرت ایک مضر آخرت تو جو کام آخرت میں مفید ہیں ان کو اختیار کرو اور جو مضر ہیں ان کو ترک کرو اور ظاہراً یہاں ایک تیسری قسم بھی اعمال کی ہے جو نہ آخرت کو نافع ہے نہ مضر (۵) اس کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ دنیا کو بھی مفید نہیں تو عبث ہے (۶) وہ قابل ترک ہے کیونکہ حدیث میں ہے من حسن السلام المرأتر که مالا یعنیه (۷) اور اگر دنیا کو مفید ہے تو وہ مباح غیر عبث ہے (۸) اور اگر دنیا کو مضر ہے تو وہ مباح تو ہے مگر ناپسندیدگی کے ساتھ (۹) جیسے طلاق کیونکہ شریعت نے ہماری دنیوی مصالح کی بھی رعایت کی ہے اور خواہ مخواہ اپنی دنیا کو برباد کرنے سے منع کیا ہے اسی وجہ سے طلاق گو مباح ہے مگر ابغض المباحات عنداللہ (۱۰) ہے کیونکہ اس سے دنیوی مصالح برباد ہوتے ہیں جبکہ بلاوجہ شرعی کے طلاق دی جائے۔

(۱) موت کے مسلسل دھیان کی وجہ سے بعض مصلحتیں فوت ہو جاتی ہیں (۲) معمولی غفلت نقصان دہ نہیں (۳) ناپسندیدہ درجہ تک (۴) یہی اعمال کی اصلاح میں رکاوٹ ہے (۵) نافائدہ مند نا نقصان دہ (۶) بیکار ہے (۷) اسلام کی خوبی یہ ہے کہ بیکار کام ترک کر دے (۸) اگر دنیا کے لئے فائدہ مند ہے تو وہ بیکار نہیں (۹) اگر اس سے دنیا کا نقصان ہوتا ہو تو جائز تو ہے لیکن ناپسندیدہ ہے (۱۰) جائز کاموں میں سب سے ناپسندیدہ ہے۔

فضولیات میں مشغولی کا انجام

اور میں نے جو عبث کی نسبت کہا ہے کہ وہ نہ نافع ہے نہ مضر یہ محض ظاہر ہی کے اعتبار سے ہے ورنہ حقیقت میں اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ افعال عبث بھی انجام کار مضر ہی (۱) میں داخل ہیں گو اس وقت مضر آخرت نہیں معلوم ہوتے۔ آدمی اپنے افعال عبث کو دیکھ لے تو اس کا سلسلہ معصیت سے ضرور ملا ہوا پائیگا۔ مثلاً کسی سے آپ نے یہ سوال کیا کہ سفر میں کب جاؤ گے اگر وہ اس سوال کا منشا صحیح سمجھ گیا تو خیر اور اس صورت میں سوال عبث ہی نہ ہوگا اور اگر وہ اس کا منشا صحیح نہ سمجھا تو اس کے دل پر اس سوال سے ضرور گرانی ہوگی کہ یہ کیوں پوچھتا ہے؟ اس کو بتلانا میری کسی مصلحت کے خلاف تو نہ ہوجاویگا اور مسلمان کے دل پر بار ڈالنا معصیت ہے یہ تو بالفعل اخروی (۲) ضروری ہوا۔ اور فی الحال یہ ہوگا کہ جب کسی کا دل کسی سے مکدر ہوجاتا ہے (۳) تو بات بات سے تکدر بڑھتا ہے آخر کار ایک دن دونوں میں خاصی عداوت ہوجاتی ہے جس سے صدہا معاصی پیدا ہوجاتے ہیں (۴) یہ اس سوال عبث کا انجام ہے اسی طرح ہر کام میں غور کر لیجئے تو فعل عبث سے انتہاءً کوئی معصیت ضرور ملی ہوئی ہے اور اس کے علاوہ عبث کے لئے ایک ضرر تو لازم ہی ہے وہ یہ کہ کثرت عبث سے قلب کا نور بجھ جاتا ہے جس سے قساوت پیدا ہوتی ہے حدیث میں ہے کثرۃ الضحك تميت القلب زیادہ ہنسنا دل کو مار دیتا ہے۔ اور حدیث میں ہے (ابعد الناس عنداللّٰہ القلب القاسی) لوگوں میں حق تعالیٰ سے زیادہ دور قلب قاسی ہے اور گو حدیث میں صرف کثرتِ ضحک کا یہ اثر بیان ہوا ہے

(۱) بیکار کام بھی آخر کار نقصان دہ ہیں (۲) دوسرے کو آزردہ دل کرنا گناہ ہے تو یہ آخرت کا نقصان ہوا (۳) جب کسی سے دل کھٹا ہوجاتا ہے (۴) سینکڑوں گناہ۔

کہ اس سے دل مرجاتا ہے لیکن تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ ہر فعل عبث میں یہی خاصیت ہے اور جب ہی تو حضور ﷺ نے دوسری حدیث میں لایعنی کو مطلقاً قابل ترک فرمایا ہے (من حسن اسلام المرأ ترکه مالا یعنیه) غرض فعل عبث کو اگر کثرت سے کیا جائے تو نور قلب زائل ہوجائیگا۔

نور قلب کا فائدہ

اور یہ لفظ اگر محض تحقیق علمی کے طور پر ہے ورنہ عبث کے لئے عادۃً کثرت لازم ہے اور نور قلب بڑی قیمتی چیز ہے اسکو ضائع نہ کرنا چاہئے کیونکہ نور قلب ہی طاعات کا ذریعہ ہے اس سے قلب میں طاعات کا داعیہ اور ایک تقاضا پیدا ہوتا ہے۔ اور اس داعیہ کی سخت ضرورت ہے محض ارادہ سے کام نہیں چل سکتا اگر ارادہ صدورِ فعل کے لئے کافی ہوا کرتا تو ارادہ تو کبھی بے نمازی کے دل میں بھی پیدا ہوجاتا ہے جس میں کبھی کامیابی ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی جو نیا نمازی ہے ذرا اس سے پوچھو کہ وہ کس مصیبت سے نماز پڑھتا ہے آپ کو جو نماز میں گرانی نہیں ہوتی اور بے تکلف پانچ وقت کی نماز ادا کر لیتے ہیں یہ اُسی داعیہ کی برکت ہے، دیوبند میں ایک معقولی طالب علم آئے تھے جو نماز کے پابند نہ تھے مگر دیوبند کے مدرسہ میں آکر نماز پڑھنا پڑی کیونکہ طلبہ ہر نماز کے وقت اُن سے کہتے کہ چلو نماز کا وقت ہے تو ان حضرت پر پانچ وقت کی نماز اس قدر گراں ہوئی کہ یوں کہنے لگے کہ حدیث میں تو آتا ہے کہ اول اول پچاس وقت کی نماز فرض ہوئی تھی پھر تخفیف کر کے پانچ وقت کی کردی گئی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دیوبند کے مدرسہ میں وہی پچاس وقت کی باقی ہے کہ جہاں ایک نماز پڑھ کے آئے تھوڑی دیر میں پھر تقاضا ہے کہ چلو نماز کو دوسری پڑھی تو پھر تقاضا ہے کہ چلو نماز کو یہاں تو رات دن نماز ہی نماز ہے تو اس

اللہ کے بندے کو پانچ وقت کی نماز پچاس وقت کی معلوم ہوتی تھی کیونکہ ابھی اس کے قلب میں داعیہ پیدا نہ ہوا تھا۔

داعیہ قلبی کا فائدہ

اور جس کے دل میں داعیہ پیدا ہو چکا ہے اس کو پھولوں ہلکی ہے بلکہ بدوں نماز کے اس کو چین ہی نہیں ملتا جو لوگ پکے نمازی ہیں ذرا وہ اپنے دل کی حالت دیکھ لیں کہ نماز کا وقت آنے کے بعد دل میں کیسی کہر چن (۱) لگتی ہے کہ جب تک نماز سے فراغت نہ کرلیں کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ اسی کا نام داعیہ ہے۔ انسان یہ سمجھتا ہے کہ میں ارادہ سے کام کرتا ہوں یہ بالکل غلط ہے ارادہ کیا چیز ہے جو طاعات کے لئے دواماً کافی ہو سکے بلکہ یہ وہ داعیہ ہے جو تم کو نچائے نچائے پھرتا ہے حضرت عراقی اسی کے بارے میں فرماتے ہیں:

صنمارہِ قلندر سزد ار بمن نمائی کہ درازودور دیدم رہ ورسم پارسائی

رسم پارسائی سے مراد زہد خشک ہے جس میں محض ارادہ وہمت سے کام ہوتا ہے اور رہ قلندر سے مراد طریق عشق ہے جس میں داعیہ سے کام ہوتا ہے تو فرماتے ہیں کہ مجھے تو طریق عشق عطا فرمایا جائے کیونکہ طریق زہد تو بہت دشوار وطویل ہے کہ ہر دن اور ہر وقت ارادہ اور ہمت سے کام لینا پڑتا ہے بخلاف طریق عشق کے اس میں تقاضا اور داعیہ سے خود بخود سب کام ہوتے رہتے ہیں ۔ پس عبث سے یہی داعیہ ونورِ قلب بجھ جاتا ہے اور جب نور قلب بجھ گیا تو اب طاعات میں گرانی ہوگی اگر جلدی تدارک نہ کیا گیا تو یہ گرانی بڑھے گی سستی پیدا ہوگی حتی کہ طاعات قضا ہونے لگیں گی پھر بھی فکر نہ ہو تو تعطل تک نوبت پہنچے گی۔ (۲)

(۱) دل میں کیسی بے چینی ہوتی ہے (۲) ترک عبادات تک نوبت پہنچ گئی۔

فضولیات میں مشغولی کی ممانعت کی وجہ

اب اس حدیث کا راز منکشف ہوگا کہ قلب قاسی سب سے زیادہ حق تعالیٰ سے دور ہے حقیقت میں قسوت قلب جو نورانیت قلب کا مقابل ہے بہت بڑا سدراہ ہے(۱) اسی لئے حضور ﷺ نے عبث کو قابل ترک فرمایا ہے ورنہ حضور ﷺ تو رحمۃ اللعالمین ہیں آپ ﷺ بلاوجہ حظوظ نفس سے منع (۲) نہیں فرماسکتے آپ نے تو نفس کی بہت رعایت فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہے: (ان لنفسك عليك حقا وان بجسدك عليك حقا وان لعينك عليك حقا وان لاهلك عليك حقا الحديث)(۳) اگر عبث میں کوئی ایسا ضرر نہ ہوتا جو ضرر عظیم کی طرف مفضی ہونے والا ہے، تو حضور ﷺ اس سے ہرگز منع نہ فرماتے اس تحقیق سے ثابت ہوا کہ عبث بھی مضر آخرت ہی ہوا۔

مباحات میں نیت کا فائدہ

باقی جو مباح عبث نہ ہو بلکہ نافع دنیا ہو (۴) وہ بھی ظاہراً تیسری قسم ہے ورنہ حقیقت میں بواسطہ یہ بھی نافع آخرت ہے بشرطیکہ امور آخرت میں اس سے کام لیا جائے مثلاً حلوا کھانا فی نفسہ مباح ہے اور بظاہر یہ نافع آخرت نہیں مگر بواسطہ یہ بھی مفید آخرت ہے کیونکہ اس سے طبیعت کو فرحت وقوت ہوتی ہے اس فرحت وقوت سے دین کا کام لو اور اگر کوئی شخص حلوا اسی نیت سے کھائے کہ اس کو کھا کر ہم خدا کی یاد زیادہ کریں گے یا اس سے ہم کو مشاہدۂ صفت منعم ہوگا تو اس کے حق میں حلوا کھانا صرف مباح ہی نہ ہوگا بلکہ مستحب ہوجائے گا اور تمام مباحات

(۱) دل کی سختی جو نور قلب کے مقابل ہے یہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے (۲) نفسانی لذتوں سے (۳) تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے تیرے جسم کا تجھ پر حق ہے تیری آنکھوں کا تجھ پر حق ہے تیرے گھر والوں کا تجھ پر حق ہے (۴) جو فضول کام بیکار نہ ہو بلکہ اس میں دنیا کا فائدہ ہو۔

کا یہی حال ہے کہ اگر ان میں آخرت کی نیت کرلی جائے تو وہ مستحبات میں بلاواسطہ داخل ہوجاتے ہیں ورنہ بواسطہ افضاء الی العمل النافع تو نافع آخرت ہوہی جاوے گا (۱) اسی طرح جو قسم مضر دنیا (۲) ہو وہ بھی بواسطہ مضر آخرت ہوجاتی ہے گو ظاہر میں مضر آخرت نہیں اسی لئے مباح میں داخل ہے کیونکہ تجربہ ہے کہ دنیا کو نقصان پہنچنے سے قلب مشوش ہوتا ہے اور تشویش قلب سے دین کے کام بھی برباد ہوتے ہیں طاعات کا بڑا مدار جمعیت قلب پر ہے (۳) اور یہ بہت بڑی نعمت ہے جس کی آجکل لوگوں کو قدر نہیں۔ پس ثابت ہوگیا کہ حقیقت میں اعمال کی دو ہی قسمیں ہیں نافع اخرت ومضر آخرت ان دونوں سے خالی کوئی فعل نہیں اور جس کو لا نافع ولا ضار (۴) سمجھا گیا تھا غور کرنے کے بعد وہ بھی انہی دو میں سے کسی ایک میں ضرور داخل ہے۔

مراقبہ آخرت کی تدبیر

پس اب مراقبہ آخرت کی تدبیر یہ ہوئی کہ جو کام کرو پہلے یہ سوچ لو کہ یہ کام فی الحال یا فی المآل مفید آخرت ہے یا مضر آخرت اگر مضر آخرت ہے تو اس کے پاس نہ بھٹکو اگر حرام ہے تب تو بچنا لازمی ہے ہی اور اگر عبث ہے تب بھی ہمت کرکے اس کو ترک کرو اور اگر مفید آخرت ہے تو وہ نجات کی تدبیر ہے اس کو ضرور کرو پھر یہ سوچو کہ جیسا گانا بجانا ویسا ہی دنیا جیسا تم کام کروگے ویسا ہی اجر ملے گا جتنا گڑ ڈالوگے اتنا ہی میٹھا ہوگا اس لئے جہاں تک ہوسکے طاعات کو اچھی طرح بجالاؤ پھر یہ بھی تو سوچو کہ تم عمل کرتے ہو نجات کامل کے لئے تو عمل بھی کامل ہونا چاہئے کیونکہ عمل کامل پر نجات کامل مرتب ہوگی اور عمل ناقص پر نجات ناقص اور

(۱) عمل نافع تک پہنچانے کی وجہ سے یہ بھی آخرت میں مفید ہوگا (۲) دنیا میں نقصان دہ ہو وہ بھی بواسطہ آخرت کے نقصان دہ ہوجاتی ہے (۳) دل کی یکسوئی (۴) نافائدہ مند نہ نقصان دہ۔

یقیناً نجات ناقصہ کو کوئی مسلمان اپنے لئے پسند نہ کرے گا بلکہ ہر شخص اس بات کا طالب ہے کہ بدوں عذاب کے نجات ہوجائے تو اس کے واسطے عمل بھی کامل ہونا چاہئے۔ دیکھو اگر تم سفر میں جاتے ہو تو کھانا اور چھتری اور بیگ ایسا ساتھ لیتے ہو جو عمدہ اور کارآمد ہو اگر اتفاق سے خادم نے پھٹا ہوا بیگ ساتھ کردیا تو تم اس کو واپس کرتے اور کارآمد بیگ ساتھ لیتے ہو اسی طرح چاقو، استرہ، پنسل، قلم سب سامان سفر میں اچھا ہے ساتھ لیا جاتا ہے نوٹ اور روپئے بھی غیر مشتبہ کہرے کہرے لئے جاتے ہیں تاکہ سفر میں دقت نہ ہو تو دنیا کے چھوٹے چھوٹے سفروں میں جب ہمارے اہتمام کا یہ حال ہے تو سفر آخرت میں جو بڑا لمبا اور دشوار گذار سفر ہے گھٹیا خراب سامان کیوں ساتھ لیا جاتا ہے اس میں تو سب سے زیادہ عمدہ سامان ساتھ لینا چاہئے۔

سفر آخرت کی تیاری واہتمام

اور اس کی یہی صورت ہے کہ کارآمد اعمال ساتھ لئے جائیں اور ہر عمل کو خوبی سے ادا کیا جائے یہ کیا ستم ہے۔ کہ دنیا کے سفر کے لئے تو سارا سامان کامل لیا جاتا ہے اور سفر آخرت کے لئے سب سامان ناقص ہے پس تم یہ سمجھ کر نماز پڑھا کرو کہ یہ ہماری جائداد ہے جو آخرت میں اور سفر آخرت میں کام دے گی اور یہ ہمارا سکہ ہے جس سے جنت خریدیں گے یہ سمجھ کر اس کو اچھی طرح ادا کرو کہ کہیں سے کھوٹا یا گھسا ہوا نہ رہے مبادا منہ پر مار دیا جائے اور تم وہاں کھڑے منہ تکتے رہ جاؤ خصوصاً غرباء کو اس کا بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہئے کیونکہ ان کے پاس دنیا میں نہ جائداد ہے نہ روپیہ تو کیا آخرت کی جائداد بھی ان کے پاس نہ ہو اور جنت کا سکہ بھی ان کی جیب میں نہ ہو اگر یہ اس سے بھی محروم رہے تو بڑی حسرت کی جگہ ہے

کہ دنیا وآخرت دونوں سے محروم رہے خصوصاً علماء اور طلبہ کو اسکا زیادہ اہتمام کرنا چاہئے کیونکہ یہ اہل دنیا کے مقابلہ میں طالبِ دین کہلاتے ہیں تو ان کو چاہئے کہ دنیا میں اگر امراء کو نیچا نہیں دکھا سکے تو آخرت میں تو ان کو نیچا دکھا دیں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی مضمون کو اشعار میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

اری الملوك بادنی الدین فدقنعوا وما ارٰهم رضوا فی العیش بالدون

میں بادشاہوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ دین کے ادنیٰ درجہ پر قناعت کئے ہوئے ہیں مگر عیش وآرام میں ادنی درجہ پر راضی ہوتے ہوئے میں ان کو نہیں دیکھتا۔

اب آگے غرباء کو خطاب فرماتے ہیں:

فاستغن بالدین عن دنیا الملوك کما استغنی الملوك بدنیا هم عن الدین

کہ تم دین کو کامل کرکے بادشاہوں کی دنیا سے ویسے ہی مستغنی ہوجاؤ جیسے وہ دنیا کو کامل کرکے دین سے مستغنی ہوگئے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں یہ حالت صرف ملوک وسلاطین کی تھی کہ وہ دین کے ادنیٰ درجہ پر قانع تھے غرباء کی یہ حالت نہ تھی۔

دین سے غفلت

مگر آج کل غرباء کی بھی یہی حالت ہے کوئی ان سے پوچھے کہ بھائی تم نے دین کو کیوں ناقص کیا۔ امراء کو تو اپنے مال و دولت اور عیش وآرام پر گھمنڈ ہے گو ان کو بھی دین کے ناقص کرنے کا حق نہیں کیونکہ وہ امارت ہے ہی کے دن کی (۱) آج مرگئے کل دوسرا دن سب امارت ختم ہوجائیگی اور آخرت میں ان سے کہا جائیگا: ﴿وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ﴾ (۲) کہ آج تم ہمارے پاس ویسے تنہا (خالی ہاتھ) آگئے جیسا کہ تم کو

(۱) کتنے دن کی (۲) سورۂ انعام: ۹۴۔

اول ہم نے پیدا کیا تھا اور جتنی نعمتیں تم کو دی گئی تھیں سب کو پس پشت چھوڑ آئے تو غفلت عن الآخرۃ کا امراء کو بھی حق نہیں مگر خیر ان کو تو مال دولت کی وجہ سے غفلت ہے، لیکن غرباء کو کیا ہو گیا کہ یہ امراء سے بھی زیادہ مستائے ہوئے ہیں۔ امراء باوجود غفلت کے پھر بھی کسی وقت اطمینان سے دین کا کچھ کام کر لیتے ہیں اور غرباء تو ہمیشہ بہانہ ہی کرتے رہتے ہیں کہ صاحب ہم کمائیں یا نماز پڑھیں بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ نماز ہی کتنی دیر کی اور اس سے کمانے میں کیونکر خلل پڑ سکتا ہے۔ دوسرے شریعت نے گو نقص اعمال کی اجازت نہیں دی مگر اختصار فی الاعمال کی اجازت دی ہے۔ اختصار اور ہے اور نقص دوسری چیز ہے نقص یہ ہے کہ ارکان کو خراب کر کے ادا کیا جائے خشوع کو فوت کیا جائے اور اختصار یہ ہے کہ ارکان میں زیادہ دیر نہ لگائی جائے لمبی سورتوں کی جگہ چھوٹی سورتیں پڑھ لو سات دفعہ سبحان ربی العظیم کی جگہ تین دفعہ کہو اور نوافل کو ترک کر کے محض فرائض وسنن مؤکدہ پر اکتفا کر لو اس میں غرباء کو کیا عذر ہے۔

اعمال ظاہرہ میں اختصار

اور ہجوم اشغال کی وجہ سے تو اختصار کی اجازت ہے ہی لیکن صوفیاء میں ایک جماعت کا مذاق یہی ہے کہ وہ اعمال ظاہرہ میں اختصار ہی کو پسند کرتے ہیں یعنی تکثیر نوافل وغیرہ نہیں کرتے پہلے مجھے بہت شبہ رہا کہ ان لوگوں کی ترقی کیسے ہوتی ہوگی کیونکہ ترقی تو اعمال سے ہوتی ہے اور اعمال ان کے پاس کم ہیں پھر الحمدللہ سمجھ میں آ گیا کہ ترقی تو اعمال ہی سے ہوتی ہے مگر اعمال دو قسم کے ہیں ایک اعمال قالبیہ یعنی اعمال ظاہرہ دوسرے اعمال قلبیہ تو اس جماعت قلیل الاعمال کے ظاہری اعمال کم ہوتے ہیں مگر اعمال قلبیہ ان کے بہت زیادہ ہیں، اور اعمال قلبیہ

یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ معاملہ درست رکھا جائے۔ قلب کی نگہداشت رکھی جائے کہ غیر حق کی طرف متوجہ نہ ہونے پائے بلکہ اکثر اوقات قلب کو ذکر میں مشغول رکھا جائے نیز قلب میں کسی مسلمان کیطرف سے غل وحقد نہ ہو(۱) سب کے ساتھ خیر خواہی ہو۔ نیز حقوق وقت ادا کیے جائیں کہ کوئی وقت ذکر سے خالی نہ جائے۔ نیز خوشی اور غمی کے حقوق ادا کئے جائیں نعمت پر شکر ادا ہوتا رہے حزن وغم میں دل خدا تعالیٰ سے راضی رہے۔ اور اس کے سوا اور بہت اعمال قلبیہ ہیں جن میں یہ جماعت ہر وقت مشغول رہتی ہے اصطلاح میں ان کو قلندر کہتے ہیں۔

صوفیاء کی اصطلاحات

مگر آجکل کے قلندر نہیں کیونکہ اس زمانہ میں تو قلندر اُسے کہتے ہیں جو چار ابرو کا صفایا کرلے(۲) گو اس کے ساتھ دل کا بھی صفایا ہوگیا ہو۔ نیز بندر نچانے والوں کو بھی قلندر کہتے ہیں خیر اصطلاح کا تو مضائقہ نہیں مگر احکام میں ان اصطلاحوں کو دخل دینے کا کیا حق ہے؟ کہ جو احکام صوفیاء نے قلندر کے لئے بیان کئے ہیں آپ ان کو اپنی اصطلاح کے قلندروں پر جری کرنے لگیں۔ اگر کوئی باپ کو بیٹا کہنے لگے اور یہی اصطلاح مقرر کرلے تو باپ کے حقوق تو پھر بھی رہیں گے۔ جیسے ایک حافظ صاحب کا نام برخوردار تھا تو کیا اس نام کی وجہ سے ان کے بیٹے کو یہ جائز ہوجائیگا کہ ان کے ساتھ برخوردار ہی کا سا معاملہ کرے ہرگز نہیں۔ اسی طرح صوفیاء کی ایک جماعت کا لقب ملامتی بھی ہے لوگوں نے اس کے معنی بھی بدل دیئے ہیں کہ جو خلاف شرع کام کرے اس کو ملامتی کہتے ہیں۔ حالانکہ فرقہ ملامتیہ صوفیا کے نزدیک وہ ہیں جو اعمال کے اخفاء کا اہتمام کرتے ہیں اور ان فرقِ صوفیاء

(۱) کینہ اور عداوت نہ ہو (۲) داڑھی، مونچھیں بھنویں، پلکیں منڈ ڈالے۔

کی اصل احادیث سے بھی ملتی ہے۔ چنانچہ قلندر کی اصل اس حدیث میں ہے کہ ایک صحابی کا گذر ایک مجمع پر ہوا ایک مجمع میں سے ایک صحابی نے ان کو دیکھ کر کہا انی لا بغض ھذا میں اس سے نفرت کرتا ہوں۔ کسی نے ان کو خبر کردی انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے جا کر شکایت کی آپ نے ان سے پوچھا کہ تم ان سے بغض کیوں رکھتے ہو؟ کہا یا رسول اللہ ضابطہ سے زیادہ نہ ایک نماز پڑھتے ہیں نہ روزہ رکھتے ہیں نہ خیرات کرتے ہیں تو یہ کیسا مسلمان ہے جو ضابطہ سے زیادہ کچھ بھی نہیں کرتا۔ پہلے صحابی نے کہا یا رسول اللہ ان سے پوچھئے کہ میں جو کام کرتا ہوں کیا اس میں کچھ نقص رہ جاتا ہے یا میں اُسے کامل طور پر ادا کرتا ہوں؟ دوسرے صحابی نے کہا نقص تو کچھ نہیں رہتا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پھر تم ان سے بغض نہ کرو ان سے محبت کرو یہ اللہ و رسول سے محبت رکھتے ہیں او کما قال یہ حدیث مسند احمد میں ہے اور ملا متی کی اصل ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے قصہ میں ہے کہ مہمان کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھے کھانا تھوڑا تھا چراغ گل کردیا مہمان سمجھا کہ یہ بھی کھا رہے ہیں مگر انہوں نے سب مہمان کو کھلا دیا غرض اختصار کا مضائقہ نہیں ہاں نقص مضر ہے مثلاً ایک شخص تو چار کپڑے پہنے ہوئے ہے اور ایک صرف کرتہ پاجامہ پہنے ہوئے ہے تو اسکا مضائقہ نہیں ہاں یہ شرط ہے کہ کرتہ پاجامہ پھٹا ہوا نہ ہو اس کے بعد دونوں کافی ہیں اس کو ناقص نہ کہیں گے اس مثال سے اختصار و نقص کا فرق سمجھ میں آ گیا ہوگا۔

تکمیل اعمال کی ضرورت

خلاصہ یہ کہ تکثیر اعمال ضروری نہیں تکمیل اعمال ضروری ہے اور اس وقت جو ہم کو تکمیل اعمال کی فکر نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ ان اعمال کو دخول جنت میں مؤثر نہیں سمجھتے اس لئے ان کو خراب سراب ادا کرتے ہیں۔

صاحبو! اس خیال کو دل سے نکال دیجئے اور اعمال کو دخول جنت ونجات من النار (۱) میں مؤثر سمجھئے گویا احتمال ہوسکتا ہے کہ شاید ہمارے عمل پر اجر نہ ملے شاید قبول نہ ہو مگر یہ ایسا احتمال ہے جیسا کہ روٹی کھاتے ہوئے یہ احتمال ہو کہ شاید یہ ٹکڑا پیٹ میں نہ پہنچے گلے ہی میں اٹک کر رہ جائے اور پھندہ لگ جاوے تو کیا اس احتمال سے کبھی کھانا چھوڑ دیا ہے؟ ہرگز نہیں پھر ان ضعیف احتمالات سے اعمال آخرت کیوں ترک کیے جاتے ہیں پھر اعمال نافعۂ دنیا (۲) میں تو کبھی ضرر کا بھی احتمال ہوتا ہے اور اعمال نافعۂ آخرت میں یہ احتمال تو ہرگز نہیں کہ وہ مضر ہوں گے۔

اعمال پر اجر

اور یہ اجر نہ ملنے کا احتمال بھی خود آپ کا لایا ہوا ہے ؎

اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست (۳)

ورنہ حق تعالیٰ کی طرف سے تو یہ ارشاد ہے: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾ (۴) ''کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں ان کی ایسی مثال ہے جیسے کسی نے ایک دانہ بویا جس سے سات بالیاں پیدا ہوئیں ہر بالی میں سو دانے ہیں (تو ایک سے سات سو ہوگئی) اور اللہ تعالیٰ (بعض کے لئے) اس سے بھی زیادہ بڑھاتے ہیں اور وہ بڑے وسعت والے ہیں (ان کے یہاں کچھ کمی نہیں) اور بڑے جاننے والے ہیں''۔

ان سے کسی کا عمل مخفی نہیں) یہ تو بذل مال کا حکم ہے اور بذل نفس تو مال سے بھی زیادہ ہے اس میں یہ فضیلت بدرجۂ اولیٰ ہوگی۔ غرض حق تعالیٰ کی تو یہ شان

(۱) جنت میں داخلہ اور آگ سے نجات میں مؤثر ہیں (۲) دنیا میں فائدہ مند اعمال میں تو کبھی نقصان کا بھی اندیشہ ہے (۳) اے بادصبا یہ سب تیرا ہی کیا دھرا ہے (۴) سورۂ بقرہ:۲۶۱۔

کرم ہے کہ وہ آپ کے اعمال کو بڑھانے کا وعدہ فرماتے ہیں اور آپ ایسے بدگمان ہیں کہ معاذ اللہ خدا پر عمل کے گھٹانے کی بدگمانی ہے ۔

بگذر از ظن خطا اے بدگماں ان بعض الظن اثم رابخواں
بدگمانی کردن وحرص آوری کفر باشد نزد خوان مہتری(۱)

اے ہے خدا تعالیٰ سے یہ بدگمانی کہ وہ تمہاری اجر کو مٹادیں گے ہرگز نہیں بلکہ وہ تو اور زیادہ بڑھائیں گے پس ان خیالات کو دل سے نکالو یہی تو وجہ ہے اعمال سے غفلت کی کہ تم ان اعمال کو دخول جنت میں دخیل نہیں سمجھتے۔

اہمیتِ اعمال

لیکن ایسا دخیل بھی نہ سمجھنا کہ ان کو علت تامہ ہی سمجھ لو یہی معنی ہیں اس حدیث کے کہ کوئی شخص اپنے عمل کے سبب جنت میں نہ جاوے گا سب اللہ تعالیٰ کی رحمت سے جاویں گے یعنی عمل دخول جنت کے لئے علت تامہ نہیں ۔لیکن علت تامہ نہ ہونے سے مطلق علیت کی نفی نہیں ہوتی ہمارے اعمال اگرچہ علت تامہ نہیں لیکن علت ناقصہ دخول جنت کے ضرور ہیں گو علت تامہ تو جز واخیر ہوتا ہے اور وہ رحمت ہے لیکن اجزاء اولیہ کو تو بھی معلول میں کسی قدر دخل ضرور ہوتا ہے۔(۲) اب سمجھو کہ علت تامہ تو نجات کی رحمت ہے مگر عادۃً رحمت ہوتی اُس شخص پر ہے جو یہ اعمال شرعیہ بجالائے چنانچہ نص موجود ہے ﴿ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴾(۳) پس اب سب اشکالات رفع ہوگئے اور ثابت ہوگیا کہ اعمال

(۱) غلط قسم کے گمان قائم کرنے سے احتراز کر قرآن کی یہ آیت پیش نظر رکھو کہ بیشک بعض گمان گناہ ہیں۔ بدگمانی کرنا اور حرص ولالچ میں مبتلا ہونا آداب بزرگی کے خلاف ہے(۲) اگرچہ علت آخری جزء ہوتا ہے لیکن پہلے جز کو بھی اس میں دخل ہوتا ہے جیسے پانی کے قطرے سے پتھر میں سوراخ ہونا گو اس کا اظہار آخری قطرے پر ہوتا ہے لیکن پہلے قطرے کو بھی اس میں دخل ہے جیسے ترازو کا پلڑا آخری دانے پر جھکتا ہے لیکن پہلے دانے کو بھی اس پلڑے کے جھکنے میں دخل ہے (۳) ''اللہ کی رحمت محسنین کے قریب ہے'' سورۂ اعراف:۵۶۔

صالحہ یقیناً کارآمد ہیں اور انکو دخول جنت میں بڑا دخل ہے یہ ہے ذرا سا نکتہ جس سے مسلمانوں کو غفلت ہورہی ہے اسی واسطے ان کے اعمال تباہ و برباد ہیں۔ اب تو لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ کیا خبر ہے یہ نماز روزہ کیا کا کیا ہوجاوے کام آئے یا نہ آئے۔ میں پوچھتا ہوں آخر کہاں اڑ جائیگا کیا خدا تعالیٰ کے علم سے نکل جائیگا ہرگز نہیں وہ تو فرماتے ہیں: ﴿اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ﴾(۱) ”کہ کوئی چیز رائی برابر بھی جہاں کہیں ہوگی خواہ آسمانوں میں یا زمین میں اللہ تعالیٰ اس کو وہی سے لے آئیں گے“۔

اگر آپ کا یہ عقیدہ ہوجائے کہ یہ اعمال یقیناً کارآمد ہیں تو پھر ان سے ہرگز غفلت نہ ہوگی اور اسی طرح اعمال معصیت میں اس کا یقین ہوجائے کہ وہ یقیناً مضر ہیں تو ان سے ضرور بچو گے پس اب میں نے غفلت کا راز بھی بتلادیا کہ آپ کو اعمال کے نافع و مضر ہونے کا استحضار نہیں اور اسکا علاج بھی بتلادیا کہ اعمال کے نافع وضار ہونے کا اعتقاد دل میں جمالو (۲) اب معلوم ہوا ہوگا کہ غفلت کتنا سخت مرض ہے جو ام الامراض بلکہ ابوالامراض کے لقب کا مستحق ہے۔ (۳)

غفلت کا علاج

اسی کی شکایت فرماتے ہیں حق تعالیٰ اس آیت میں جو میں نے اول تلاوت کی تھی ﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ﴾ اور غفلت کا علاج استحضار ہے کیونکہ علاج الشئ بالضد مسئلہ مسلمہ ہے (۴) اور استحضار کا ماخذ میں نے حدیث سے بتلادیا (اکثروا ذکر ھاذم اللذات) یعنی

(۱) سورۂ لقمان: ۱۶ (۲) اعمال کے مفید اور نقصان دہ ہونے کا اعتقاد رکھو (۳) جو تمام بیماریوں کی ماں بلکہ باپ کہلانے کا مستحق ہے (۴) اور غفلت کا علاج دھیان کرنے سے ہوتا ہے کیوں کہ ضد کے ذریعہ علاج کرنا ایک تسلیم شدہ مسئلہ ہے کہ سردی کا علاج گرمی سے کیا جاتا ہے۔

آخرت کو یاد کیا کرو اور خاص عمل کے وقت اس کے استحضار کی تدبیر بھی بتلادی صل صلوۃ مودع کہ ہر عمل کو یہ سمجھ کر ادا کرو کہ شاید یہ ہمارا آخری ہی عمل ہو۔ پس اب ہر پہلو سے علاج مکمل ہوگیا۔ خلاصہ یہ کہ اعمال پر جزا وسزا کے مرتب ہونے کا استحضار رکھو اگر ہر وقت نہ ہوسکے تو کم از کم عمل کے وقت ہی یہ بات سوچ لیا کرو کہ یہ عمل مفید آخرت ہے یا مضر(۱)۔ پھر یہ بھی سوچ لو کہ شاید اس کے بعد پھر کسی عمل کی نوبت نہ آئے اور یہ عمل آخری ہو۔ اب اگر وہ مفید آخرت ہے تو اس خیال کے بعد اچھی طرح ادا ہوگا اور اگر مضر ہے تو اس خیال کے آنے سے اُس کا ارادہ باقی نہ رہے گا۔ اور اگر کسی کو آخرت بعید(۲) معلوم ہوتی ہو تو وہ یہ خیال کرلے کہ آخرت موت سے شروع ہوجاتی ہے اس سے استبعاد رفع ہوجائیگا میں نے اس وقت ساری باتیں آسان آسان بیان کی ہیں میں آپ کو ایسی بات بتلانا نہیں چاہتا جس میں دشواری یا بکھیڑا(۳) ہو اب عمل کرنا آپ کا کام ہے میں اپنا کام ختم کرچکا اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ ہم کو توفیق خیر اور فہم سلیم عطا فرمائیں۔(۴)

واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین وصلی اللّٰہ تعالیٰ وسلم علیٰ خیر خلقہٖ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ اٰلہٖ واصحابہٖ اجمعین

(۱) آخرت میں فائدہ مند ہے یا نقصان دے (۲) دور معلوم ہو (۳) جس میں مشکل یا پریشانی ہو (۴) اللہ تعالیٰ سب پڑھنے والوں کو فہم سلیم عطا فرمائے اور وعظ سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

خلیل احمد تھانوی

۱۷/ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ